بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گیارھویں شریف نذر و نیاز، عرس
فاتحہ خوانی، تعینِ یوم کا ثبوت

وما اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰه

کا

تحقیقی بیان

مُرتّبہ

پروفیسر صاحبزادہ محمد ظفر الحق بندیالوی

حجاز پبلی کیشنز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

قربِ قیامت کے آثار دنیا میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ بدعقیدگی کا ایک طوفانِ عظیم برپا ہے جو اہلِ اسلام کو اپنے ساتھ بہالے جانے کے درپے ہے۔ ہر شخص مذہبی احکام کو اپنے عقل کی کسوٹی پر جانچنا چاہتا ہے۔ نئے نئے مجتہدین آئے دن مسلمانوں پر نئے نئے فتوے لگا کر خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق بن رہے ہیں اور مسلمانوں کو مشرک کہنے اور ان میں باہمی منافرت پھیلانے کا وبال اپنے سر لے رہے ہیں۔

مسلمانوں میں یہ بات سلف صالحین کے زمانہ سے ہی چلی آرہی ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر ذبح کرتے ہیں، پھر کسی ولی اللہ کے ایصالِ ثواب کے لیے غرباء میں تقسیم کر دیتے ہیں، چنانچہ بعض لوگ ایسا کرنے والوں کو مشرک اور اس جانور کو حرام و ناجائز کہہ رہے ہیں اسی طرح عرس و گیارہویں کرنے والوں کو شرک کے لقب سے نوازتے ہیں اور اولیاء اللہ کی نذر بمعنی ایصالِ ثواب کے لیے صدقہ و خیرات کرنے والوں پر بھی شرک کا فتوٰی لگا رہے ہیں اور اہلِ اسلام کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ ناچیز مذکورہ مسائل کو شریعتِ حقہ کی روشنی میں ثابت کرنے کے لئے اپنے والدِ محترم شہبازِ طریقت امیرِ شریعت تاج الفقہا صاحبزادہ محمد عبدالحق مدظلہ کے مندرجہ بالا موضوعات پر ایمان افروز اور باطل سوز خطابات کو ضبط و ترتیب اور مناسب اضافوں کے ساتھ پیشِ ناظرین کرنے کی جسارت کر رہا ہے۔ انشاء اللہ آپ کو اس رسالہ میں کسی فرقہ پر تنقید یا دل آزاری نظر نہیں آئے گی، بلکہ فقط مذکورہ بالا مسائل کی تحقیق ہوگی اور ان مسائل کے بارے میں عقیدۂ اہلِ سنت کو دلائل کے ساتھ سہل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خدا تعالیٰ مخالفین کو بھی یہ رسالہ غور سے پڑھنے اور پھر ہدایت پانے کی توفیق عنایت فرمائے۔

خاکپائے علماءِ حق: محمد ظفر الحق بندیالوی

فہرستِ مضامین

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تفسیر مستند مفسرین کی نظر میں

تفسیر جلالین: پ۲، رکوع ۵

نوٹ: تفسیر جلالین وہ مستند تفسیر ہے جو اہل سنت اور دیوبندی حضرات سب کے مدارس میں شامل نصاب ہے:

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اَیْ مَا ذُبِحَ عَلٰی اِسْمِ غَيْرِهٖ وَالْاِهْلَالُ رَفْعُ الصَّوْتِ وَكَانُوا يَرْفَعُوْنَهٗ عِنْدَ الذَّبْحِ لِاٰلِهَتِهِمْ۔

ترجمہ: وما اهل به لغیر الله یعنی جو غیر خدا کے نام پر ذبح کیا گیا اور اہلال کے معنی آواز بلند کرنا ہیں اور مشرکین اپنے معبودوں کے لیے ذبح کرنے کے وقت آواز بلند کرتے تھے۔

تفسیر ابن عباس:

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اَیْ مَا ذُبِحَ لِغَيْرِ اسْمِ اللّٰهِ عِنْدَ الْاَصْنَامِ۔

ترجمہ: یعنی جو اللہ کے نام کے بغیر عمداً بتوں کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔

تفسیر کبیر:

فمعنیٰ قوله وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ يعني مَا ذُبِحَ لِلْاَصْنَامِ وَهُوَ قَوْلُ مُجَاهِدٍ وَالضَّحَّاكِ وقتادة۔

وما اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے معنیٰ یہ ہیں کہ جو بتوں کے لیے ذبح کیا گیا ہو۔ یہ قول مجاہد و ضحاک و قتادہ کا ہے۔

تفسیر علامہ ابی سعود:

وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اَیْ رُفِعَ بِهِ الصَّوْتُ عِنْدَ ذَبْحِهٖ لِلصَّنَمِ۔

ترجمہ: وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ یعنی وہ چیز جس کو بت کے لیے ذبح کے وقت آواز بلند کی گئی ہو۔

تفسیر مدارک:

وَمَا اُهِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ اَیْ ذُبِحَ لِلْاَصْنَامِ فَذُکِرَ عَلَیْہِ غَیْرُ اسْمِ اللہِ وَاَصْلُ الْاِھْلَالِ رَفْعُ الصَّوْتِ اَیْ رُفِعَ بِہٖ الصَّوْتُ لِلصَّنَمِ وَذٰلِکَ قَوْلُ اَھْلِ الجَاھِلِیَّۃِ بِاسْمِ اَللَّاتِ وَالْعُزّٰی۔

ترجمہ: وَ اُهِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ، یعنی جو بُتوں کے لیے ذبح کیا گیا کہ اس پر غیر خدا کا نام ذکر کیا گیا اور اصل میں اہلال آواز بُلند کرنا ہے، یعنی اس کے ساتھ بُت کے لیئے آواز بُلند کی گئی اور یہ اہل جاہلیت کا بنام لات وعزّیٰ کہنا تھا (لات وعزّیٰ مشرکین کے بُتوں کے نام ہیں، اُن کے لیے جو جانور قربان کرتے تھے، اُس کو بنام لات و عزّیٰ کہہ کر ذبح کرتے تھے)

تفسیر بیضاوی: (مطبوعہ مصر جلد اوّل صہ ۲۱۱)

وَمَا اُهِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ اَیْ رفع بہ الصوت عند ذبحہ للصنم

وَمَا اُهِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللہِ یعنی بُلند کی گئی اُس کے ساتھ آواز ذبح کے وقت، واسطے بُت کے۔

تفسیر رُوح المعانی (جز ثانی صہ ۴۲)

وما اُهِلَّ بِہٖ لِغَیرِ اللہِ ای ما وقع متلبسا بہ ای بذبحہ الصوت لغیر اللہ تعالیٰ۔

وما اُهِلَّ بِہٖ لغیر اللہ یعنی وہ واقع ہو اس کے ساتھ یعنی اسکے ذبح کے ساتھ آواز غیر اللہ کے لیے۔

تفسیر خازن: (جلد اوّل صہ ۴۲۶)

یعنی مَا ذکر علیٰ ذبحہٖ غیر اسم اللہ وذٰلِکَ اِن العرب فی الجاھلیۃ کانوا یذکرون اسماء اصنامھم عند الذبح فحرم اللہ ذٰلِکَ بھذہِ الآیۃ

تفسیر صاوی : (جلد دوم ص ۴۷ ، مطبوعہ مصر)

وما اُھِلَّ بہ لغیر اللہ بہ ۔ قولہ ای ذبح علی اسم غیرہٖ

یعنی ذبح کیا جائے غیر اللہ کے نام پر

تفسیر فتح الرحمٰن (ص ۳۳ مؤلف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)

انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اُھل بہ لغیر اللہ

جز ایں نیست کہ حرام کردہ است بر شما مردار را و خون را و گوشت خوک را ۔

و آنچہ آواز بلند کردہ شود در ذبح وے بغیر خدا ۔

ترجمہ : سوائے اس کے نہیں کہ حرام کیا تم پر مردار کو اور خون کو اور گوشت سور کا

اور وہ جس پر آواز بلند کی جائے ، اُس کے ذبح کے وقت غیر اللہ کی ۔

تفسیر موضح القرآن :

"حرام ہے تم پر جو آواز اُٹھا دیں ۔ یعنی کہیں اس کو ذبح کرنے کے وقت نام سوائے

اللہ تعالیٰ کے ۔

اِن تفسیروں کے علاوہ تفسیر فتح القدیر ، تفسیر کشاف ، تفسیر مراغی ، تفسیر

ابن کثیر ، تفسیر ابن جریر ، تفسیر جمل ، تفسیر عمدۃ التفسیر ، تفسیر مفردات القرآن ،

تفسیر معالم التنزیل ، تفسیر جامع البیان ، تفسیر روح البیان ، تفسیر قرطبی ،

تفسیر انوار التنزیل ، تفسیر دُرِ منثور ، تفسیر تاج التفاسیر میں وَمَا اُھِلَّ بِہ لغیر اللہ

کی یہی تفسیر لکھی گئی ہے کہ " وہ جو ذبح کیا گیا غیر اللہ کے نام پر ۔"

صراطِ مستقیم (شاہ اسمٰعیل دہلوی) (وہابیوں کا امام)

قوله وما اُهلّ به لغیرالله ظاهر ماذبح لِغیرالله

ترجمہ: قول ہے، وما اُھل بہ لغیر اللہِ اس کے ظاہر معنی ہیں جو غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا۔

تفسیر فتح البیان (جلد اوّل ص ۲۲۲)

وما اُهلّ بهٖ لِغیرالله یعنی ماذبح للاصنام والطواغیت وصحیح فی ذبح لِغیرالله وما اُهلّ بهٖ لِغیرالله۔

یعنی جو بتوں اور طاغوتوں کے لیے ذبح کیا جاتے اور درست یہ ہے کہ غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا۔

نوٹ: بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُھِلّ کا لفظ لُغتہً اور عُرفاً ذبح کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ اُن کی یہ بات غلط ہے کیونکہ فصاحت و بلاغت کے امام حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُھِلّ کو ذبح کرنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ آپ کا قول بلا اختلاف حجت و سند ہے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

اذا سمعتم الیهود والنصارٰی یهلون لغیرالله فلا تاکلوا واذا لم تسموهم فکلوا فانّ الله قد احلّ ذبائحهم وهو یعلم وما یقولون (فتح البیان جلد اوّل ص ۲۲۲)

ترجمہ: یعنی جب تم سنو کہ یہود و نصاریٰ غیر خدا کا نام لے کر ذبح کرتے ہیں، تو اُن کا ذبیحہ نہ کھاؤ اور اگر نہ سنو تو کھا لو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ذبیحے کو حلال کیا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ وہ کہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول میں یھلّون بمعنی یذبحون استعمال ہوا ہے۔

تفسیر احکام القرآن

امام ابوبکر جصاص حنفی رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق تفسیر "احکام القرآن" میں اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

ولاخلاف بین المسلمین ان المراد به الذبیحة اذا اھلّ لغیر اللہ عند الذبح۔

ترجمہ: یعنی سب مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے مُراد وہ ذبیحہ ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے۔

اعتراض: بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تو اپنی تفسیر میں وما اُھلّ بہ لغیر اللہ کا ترجمہ "وہ پکارا گیا اُس پر نام سوائے اللہ کے" کیا ہے۔

جواب: اُن لوگوں کی سب سے بڑی دوڑ اسی تفسیر تک ہے اور ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ جو اعتراض ان وہابیہ پر پڑتا ہے۔ وہی اعتراض صاحبِ تفسیر عزیزی پر بھی ہوتا ہے۔ صاحبِ تفسیر عزیزی کو کب گنجائش ہے کہ تفاسیر معتبرہ کے خلاف اور فقہاء محققین سے انحراف کرکے اپنے زعم کے مطابق یہ معنیٰ کریں کہ قبل ذبح غیر اللہ کے نام سے مشہور ہونا مراد ہے۔ کوئی بھی منصف مزاج اور ذی شعور شخص اگرچہ صاحبِ تفسیر عزیزی کا بیٹا یا شاگرد ہی کیوں نہ ہو اس بارے میں شاہ صاحب کے قول ہی کو رد کرے گا اور اکیلے شاہ عبدالعزیز صاحب کے مقابلے میں جمِ غفیر مفسرین کے قول کو جو وقت اور ذبح کی قید لگاتے ہیں، کیونکر چھوڑے گا، کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہے: اتبعوا السواد الاعظم جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے یہی حکم دیا ہے کہ وقتِ اختلاف، علماءِ امت کے اکثر علماء کے قول کی اتباع کرو۔

صاحبِ تفسیرِ عزیزی کا قول باطل ہے، کیونکہ اگر اس کو سچّا مان لیا جائے، تو پھر لازم آئے گا کہ باقی تمام مفسّرین نے اس آیت کی تفسیر میں تحریف کی ہے اور ان تمام اکابر کو جنہوں نے ما اُھلّ بہٖ میں وقتِ ذبح کی قید لگائی ہے جن میں صحابی اور تابعی بھی ہیں آیت کی تحریف کرنے والا ماننا پڑے گا۔ نیز اگر فقط غیر اللہ کا نام پکارنے سے ہی حرام ہو جاتا، تو پھر بحیرہ اور سائبہ بھی حرام ہو جاتیں، حالانکہ خدا تعالیٰ نے اُن کو طیّب و حلال فرمایا ہے۔ جب شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر کو اُن کے معاصرین و تربیت یافتوں اور بعد والوں نے خلافِ جمہورِ متقدمین دیکھا، تو اس قول کی تردید کماحقہٗ فرمادی اور حق واضح کر دیا جیساکہ "بوارقِ محمدیہ" وغیرہ سے ظاہر و آشکار ہے۔ رامپور وغیرہ سے بھی اس کا رد ہوا۔ "تفسیر مجددی معروف بہ تفسیر رؤفی" میں اس کو اس طور پر ظاہر فرمایا،

"تفسیر فتح العزیز میں کسی شخص نے الحاق کر دیا ہے اور یوں لکھ دیا ہے کہ "اگر کسی بکری کو غیر کے نام سے منسوب کیا ہو تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرنے سے وہ حلال نہیں ہوتی اور غیر کے نام کی تاثیر اس میں ہوگئی ہے کہ اللہ اکبر کے نام کا اثر ذبح کے وقت حلال کرنے کے واسطے بالکل نہیں ہوتا" سو یہ بات کسی نے ملادی ہے۔"

خود مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کبھی ایسا سب مفسّرین کے خلاف نہ لکھیں گے اور اُن کے مرشد و اُستاد اور والد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب نے "فوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں مَا اُھِلّ کے معنی میں مَا ذُبِحَ لکھا ہے، یعنی ذبح کرتے وقت جس بُت کا نام لیوے سو حرام ہے اور مُردار جیسا ہے اور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا سو کیونکر حرام ہے اور مردار جیسا ہے۔ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب یوسفی انصاریؒ نے "فتح العزیز" کی اس عبارت کا لفظ بلفظ جواب لکھ کر رسالہ تحلیل ما اُھِلّ اللہ فی تفسیر ما اُھِلّ

بہٖ لغیر اللہ اسی زمانہ میں لکھ کر طبع کروا کر شائع کیا اور بعد میں اسی رسالہ میں یوں تحریر کیا:

"جناب مولانا عبدالعزیز صاحب مقتدا زماں اور سند اہلِ زماں تھے۔ بارہا آپ کے درس و وعظ میں حاضر ہوا ہوں اور عجیب و غریب تحقیقات آپ کی زبان فیض ترجمان سے سُنی ہیں اور یہ کلام جو فتح العزیز میں آیت ما اُھِلّ بہ لغیر اللہ میں درج ہے۔ شاہ صاحب سے محلِ تعجب و حیرت ہے۔ شاید بعض کاتبوں نے امرِ باطل کی ترویج دینے کے لیے تفسیر فتح العزیز میں داخل کر دیا ہو۔ تفسیر ما اُھِلّ بہ لغیر اللہ کی جو اس میں درج ہے۔۔ وہ قرآن کی تفسیر رائے سے ہے (جو کہ حرام ہے) اور تمام اہلِ تفسیر و محدثین نے ما اُھِلَّ بہ لغیر اللہ کی تفسیر ما ذبح لغیر اسم اللہ کی ہے۔ یعنی آیتِ کریمہ میں ما اُھِلَّ بہٖ لغیر اللہ سے یہ مراد ہے جو کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔"

مذکورہ بالا رسالہ نیز "نور اق محمدیہ" اور تفسیر رؤفی بھی مطبوعہ ہیں۔ علاوہ ازیں "تفسیر عزیزی" میں خود متضاد اقوال موجود ہیں، جیسا کہ اہلِ بصیرت سمجھ سکتے ہیں اور "نور اق محمدیہ" وغیرہ میں اس کو واضح طور پر مع تردید ذکر کیا گیا ہے۔ تفسیر عزیزی میں وما اُھِلّ بہٖ لغیر اللہ کی اس تفسیر کے خلاف شاہ صاحب کا اپنا قول مذکور ہے۔

"زبدۃ النصائح" میں شاہ صاحب کا فتویٰ مذکور ہے:

متیٰ کان اراقۃ الدم للتقرب الی غیر اللہ حرمت الذبیحۃ ومتیٰ کان اراقۃ الدم للہ والتقرب الی الغیر بالاکل والانتفاع حلت الذبیحۃ وعلیٰ ھٰذا قلنا لو اشتریٰ لحمًا من السوق او ذبح بقرۃ او شاۃ لاجل ان یطبخ مرقا و

طعاماً لتطعم الفقراء ويجعل ثوابها لروح فلان
حلت بلا شبهة۔

ترجمہ: "جبکہ خون کا بہانا یعنی جانور کا ذبح کرنا تقرباً الیٰ غیر اللہ کے واسطے ہو تو وہ ذبیحہ حرام ہوگا اور جبکہ اُس کا ذبح کرنا اللہ کے لیے ہو اور کھلانے اور نفع پہنچانے کے ساتھ غیر اللہ کی طرف تقرب مقصود ہو تو وہ ذبیحہ حلال ہوگا اور اسی بناء پر ہم نے یہ کہا کہ اگر کسی نے گوشت خریدا یا گائے یا بکری کو اس خیال سے ذبح کیا کہ اس کا شوربہ یا کھانا پکا کر فقیروں کو کھلائیں گے اور اس کا ثواب فلاں کی رُوح کو بخشیں گے، تو یہ ذبیحہ بلاشبہ حلال ہوگا۔"

شاہ عبدالعزیز صاحب اسی مسئلہ میں فتاویٰ عزیزی جلد اوّل ص۱۴۲ پر فرماتے ہیں:

متیٰ کان اراقۃ الدم لتقرب الیٰ غیر اللہ حرمت الذبیحۃ
ومتیٰ کان اراقۃ الدم للہ والتقرب الی الغیر بالاکل والانتفاع حلت الذبیحۃ۔

ترجمہ: "یعنی اگر کسی جانور کا خون اس لیے بہایا جائے کہ اس سے غیر کا تقرب حاصل کرنا ہو تو وہ ذبیحہ حرام ہوگا اور اگر خون اللہ کے لیے بہانے اور اسے کھانے اور اس سے نفع حاصل کرنے سے کسی غیر کا تقرب مقصود ہو تو ذبیحہ حلال ہوگا۔"

قارئین!! مقامِ غور ہے کہ تمام مستند مفسرین وما اُھل بہ لغیر اللہ کا یہی ترجمہ کر رہے ہیں کہ "جو ذبح کیا جائے واسطے غیر اللہ کے"۔ اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے والدِ محترم شاہ ولی اللہ صاحب جو ہر لحاظ سے شاہ عبدالعزیز سے بڑھ کر ہیں۔ انہوں نے بھی "فوز الکبیر فی اصول التفسیر" میں وما اُھل بہ لغیر اللہ کا معنی وما ذبح لغیر اللہ کیا ہے، اور پھر لطف یہ کہ خود شاہ عبدالعزیز صاحب نے بھی "زبدۃ النصائح" میں فرمایا کہ جب جانور کا ذبح کرنا تقرباً الیٰ غیر اللہ کے واسطے ہو تو وہ حرام ہے اور اگر ذبح کرنا اللہ کے لیے ہو اور صرف کھلانے اور نفع پہنچانے کے ساتھ غیر اللہ کی طرف تقرب مقصود ہو تو وہ ذبیحہ حلال ہے تو پھر یہ بات

مسلّمہ ہوجاتی ہے کہ وما اُھلَّ بہٖ لغیر اللہ کی جو تفسیر و تشریح "تفسیر عزیزی" میں درج ہے۔ وہ شاہ عبد العزیز کی نہیں، بلکہ کسی بد عقیدہ نے جان بوجھ کر داخل کر دی ہے۔

اعتراض: اگر وما اُھلّ بہٖ لِغیر اللہ کا معنیٰ وما ذبح لغیر اسم اللہ ہے، تو پھر قرآن میں ما ذبح علی النصب کے فرمانے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: سلطان المفسرین حضرت علامہ بغوی نے "تفسیر معالم التنزیل" میں ماذبح علی النصب کی یوں تشریح فرمائی ہے:

واختلفوا فیہ فقال مجاھد وقتادہ کانت حول البیت ثلثماۃ وستون حجرًا منصوبۃً کان اھل الجاھلیۃ یعبدونھا ویعظمونھا ویذبحون لھا ولیست ھی باصنام انما الاصنام ھی الصورۃ المنقوشۃ

ترجمہ: ماذبح علی النصب کے معنیٰ میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے فرمایا کہ بیت اللہ شریف کے اردگرد ۳۶۰ پتھر گاڑے ہوئے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے لوگ ان کی عبادت کرتے تھے اور ان پتھروں کی تعظیم کرتے تھے اور انہی پتھروں کے تقرب کے لیے ذبح کرتے تھے اور وہ پتھر بُت نہیں تھے، کیونکہ بُت تو صورتیں ہوتی ہیں منقوشہ۔

تو اب ما اُھلّ بہٖ لغیر اللہ اور ما ذبح علی النصب کا فرق واضح ہوگیا۔ ما اُھلَّ بہٖ لِغیر اللہ کا بھی مفہوم یہ ہے کہ کسی جانور پر بوقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے اور ما ذبح علی النصب کا یہ معنیٰ ہوگا کہ کسی غیر اللہ یعنی پتھر وغیرہ کو معبود سمجھتے ہوئے اس کی تعظیم اور تقرب کے لیے کسی جانور کو ذبح کیا جائے، تو اس جانور پر بھی چونکہ بوقت ذبح اللہ کا نام نہیں لیا گیا اور معبود باطل کی تعظیم اور تقرب کے لیے ذبح کیا گیا ہے لہٰذا یہ

بھی حرام ہے۔اس جانور پر اگرچہ معبودِ باطل یعنی غیر اللہ کا نام نہیں لیا گیا، لیکن چونکہ معبودِ باطل کی تعظیم و تقرب کے لیے ذبح کیا گیا ہے، اس میں حرمت سرایت کر جائے گی۔

وقال الاخرون هي الاصنام المنصوبة فمعناه ما ذبح على اسم النصب قال ابن زيد وما ذبح على النصب وما اهل به لغير الله هما واحد۔

اور دوسرے علماء نے یہ فرمایا کہ ما ذبح علی النصب سے مراد گاڑے ہوئے بُت ہیں اور یہاں پر حذف مضاف ہے اور اس کا معنیٰ ہوگا ما ذبح علیٰ اسم النصب وہ جانور کہ ذبح کیا جائے اوپر نام بُت کے اور ابن زید نے فرمایا اس صورت میں ما اُھِلَّ بِہٖ لغیر اللہ اور ما ذبح علی النصب کا ایک ہی معنیٰ ہوگا یعنی وہ جانور کہ جس پر بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے۔

وما ذبح علی النصب، امام ابن جریر نے قتادہ سے نقل کیا ہے: والنصب الحجارة كان اهل الجاهلية يعبدونها ويذبحون لها۔

نصب وہ پتھر ہیں، جن کی زمانۂ جاہلیت میں پوجا کی جاتی تھی اور ان کے لیے جانور ذبح کیے جاتے تھے۔

واضح امتیاز بعض لوگ ان چیزوں کو بھی حرام کہہ دیتے ہیں کہ جن پر ذبح سے پہلے بھی کسی نبی یا ولی کا نام لے دیا جائے۔ خواہ اُس چیز کو ذبح کے وقت اللہ کے نام سے ہی ذبح کیا جائے، کیونکہ اس طرح مشرکین کے مشرکانہ عمل سے مشابہت ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ بھی بعض اشیاء پر اپنے بُتوں کے نام لے دیا کرتے تھے، لیکن اگر نظرِ انصاف سے دیکھا جائے، تو مسلمانوں کے اس عمل کو مشرکین کے عمل سے ظاہری یا باطنی، صوری یا معنوی کسی قسم کی بھی مشابہت نہیں، کیونکہ کفار جب ایسے جانوروں کو ذبح کرتے تھے، تو اپنے بُتوں کا نام لے کر ان کے گلے پر چھری پھیرتے، وہ کہتے باسم اللات والعزّٰی (لات اور عزّٰی کے

نام سے ہم ذبح کرتے ہیں) اور مسلمان ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کسی کا نام لینا گوارا ہی نہیں کرتے، اس لیے ظاہری مشابہت نہ ہوئی۔ نیز کافر ان جانوروں کو ذبح کرتے تو ان بتوں کی عبادت کی نیت سے ان کی جان تلف کرتے۔ کسی کو ثواب پہنچانا مقصود نہ ہوتا تھا، اور اہل سنت کسی غیر خدا کی عبادت کی نیت سے یا کسی کی خاطر ان کی جان تلف نہیں کرتے، بلکہ اُن کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اس جانور کو اللہ کے نام سے ذبح کرنے کے بعد یا یہ کھانا پکانے کے بعد فقراء اور عام مسلمان کھائیں گے اور اُس کا جو ثواب ہوگا، وہ فلاں صاحب کی رُوح کو پہنچے واضح ہوگیا کہ مسلمانوں کے عمل اور مشرکین کے طریقہ میں زمین و آسمان سے بھی زیادہ فرق ہے۔ ہاں اگر کوئی ذبح کرتے وقت غیر خدا کا نام لے کر یا کسی غیر خدا کی عبادت کے لیے کسی جانور کو ذبح کرے، تو اس چیز کے حرام ہونے اور ایسا کرنے والے کے مشرک و مُرتد ہونے میں کوئی شک نہیں۔

جو لوگ ایسی چیزوں کو کہ جن پر ذبح سے قبل کسی نبی یا ولی کا نام لیا گیا ہو، حرام کہتے ہیں، وہ اپنے اس دعوے کے اثبات میں صرف یہی آیت پیش کرتے ہیں کہ وَمَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ لیکن تمام مفسرین اس کا یہی ترجمہ کر رہے ہیں کہ "جو ذبح کیا گیا ہے غیر اللہ کے نام پر" لہٰذا منکرین کا اس آیت سے استدلال پکڑنا بھی بالکل غلط ہے۔ اگر کسی جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کرنے کے بعد مقصد صرف ایصالِ ثواب ہو جیسے کہ ہر کلمہ گو کا ہوتا ہے، تو اس کو طرح طرح کی تاویلات سے حرام کہنا کسی اہلِ علم کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔

کسی چیز پر فقط غیر اللہ کا نام لینے سے وہ حرام نہیں ہو جاتی

بعض لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کسی چیز کی غیر اللہ کی طرف مجازی طور پر نسبت کر دی جائے تو پھر بھی وہ چیز حرام ہو جاتی ہے اور وقت ذبح کہی جانے والی تکبیر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، لیکن ہم اہل سنت و جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی چیز پر بیشک جتنی دفعہ غیر اللہ کا نام لیا جائے،

لیکن اگر بوقتِ ذبح خداوند عزّوجل کا نام لے کر ذبح کر دیا جائے، تو وہ چیز حلال ہے۔ خداوند کریم علیم وخبیر کا ارشاد ہے:

ماجعل من بحیرۃٍ ولاسائبۃٍ ولاحامٍ ولٰکنّ الذین کفروا یفترون علی اللّٰہ الکذب واکثرھم لایعقلون

ترجمہ: "نہیں مقرر کیا اللہ تعالیٰ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام، لیکن جنہوں نے کفر کیا، وہ تہمت لگاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹی اور اکثر ان میں سے کچھ سمجھتے ہی نہیں"

یعنی ان جانوروں کی زندگی میں ان پر کسی کا نام پکارنے سے حرام نہیں ہوا کرتا، ہاں ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارنا حرام کر دے گا۔ یہ چار جانور وہ تھے، جنہیں مشرکین عرب بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ پھر ان کا گوشت دودھ حرام سمجھتے تھے۔ اُن کی تردید میں یہ آیت اُتری۔ اگر شرعی لحاظ سے کسی جانور پر فقط غیر اللہ کا نام پکارنے سے ہی وہ حرام ہو جاتا، تو پھر کافر سچے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جانوروں پر فقط غیر اللہ کا نام پکارنے اور اُن کے لیے نامزد کرنے سے وہ حرام نہیں ہو جاتے، بلکہ صرف وقتِ ذبح غیر اللہ کا نام پکارنے سے وہ حرام ہوتے ہیں۔

تفسیر:

(۱) **بحیرہ**: اس کا لغوی معنی ہے کان چرا — وہ اونٹنی جو پانچ بچے پیدا کرتی اور آخری بچہ نر ہوتا، تو کان چیر کر اُسے چھوڑ دیتے۔ اس پر سواری کرنا، اُس کا گوشت کھانا سب اپنے اوپر حرام کر لیتے۔

(۲) **سائبہ**: اگر کوئی آدمی سفر پر جاتا یا بیمار ہوتا تو وہ نذر مانتا کہ اگر میں خیریت سے گھر پہنچ گیا یا اس کی بیماری سے صحت یاب ہو گیا، تو میری یہ اونٹنی سائبہ ہوگی اور اس کا دودھ، گوشت اور اس پر سواری بھی بحیرہ کی طرح حرام تصور کرتے۔

(۳) وصیلۃ: اُن کی بکری اگر بچی پیدا کرتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیتے اور بچہ پیدا کرتی تو وہ اُن کے بتوں کا ہوتا اور اگر ایک شکم سے بچی اور بچہ جنتی تو پھر بھی وہ بچی کو بچہ کے ساتھ ملا کر بتوں کی نذر کر دیتے۔ یہ بچی جو اپنے بھائی کے ساتھ مل کر بتوں کی نذر ہوتی، اُس کو وصیلہ کہتے۔

وَصَلَتِ الْاُنْثٰی اَخَاهَا۔

(۴) حام: وہ اونٹ جس کی جفتی سے دس بچے پیدا ہوتے، اس کی سواری وغیرہ بھی اپنے اوپر حرام کر دیتے اور اُسے حام کہا جاتا۔

نوٹ: یہ سارے جانور وہ اپنے بتوں کے لیے نذر کر دیتے اور ان سے کسی قسم کا فائدہ اُٹھانا اپنے اوپر حرام کر دیتے۔

بخاری شریف جلد ثانی صـ۶۶۵ کتاب التفسیر میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کی تفسیر یوں کی گئی ہے۔

بحیرہ: اَلَّتِیْ یُمْنَعُ دَرُّهَا لِلطَّوَاغِیْتِ

بحیرہ وہ جسکا دودھ بتوں کے لیے روک دیا جاتا۔

اور سائبہ کی تفسیر: وَالسَّائِبَةُ كَانُوْا يُسَيِّبُوْنَهَا لِاٰلِهَتِهِمْ

سائبہ وہ جسکو کافر اپنے معبودوں کے لیے مقرر کر دیتے تھے

اور وصیلہ کے بیان میں ہے: وکانوا یسیبونها لطواغیتهم

وصیلہ وہ جسکو کافر اپنے بتوں کیلئے مقرر کر دیتے تھے

اور حام کے متعلق مرقوم ہے: فاذا قضی ضرابه دعوه لطواغیت۔

حام جس وقت اپنا مقصد پورا کرتا اسکو بتوں کیلئے چھوڑ دیتے تھے

فتح الباری جلد ہشتم صـ۲۸۸، عینی شرح بخاری

وَالسَّائِبَةُ كَانُوْا يُسَيِّبُوْنَهَا لِاٰلِهَتِهِمْ کے تحت فرماتے ہیں:

قَالَ اَبُوعُبَیدَۃَ کَانَتِ السَّائِبَۃُ مِنْ جَمِیعِ الْاَنْعَامِ، وَتَکُونُ مِنَ النُّذُورِ لِلْاَصْنَامِ فَتُسَیَّبُ فَلَا تُحْبَسُ عَنْ مَرْعًی وَلَا عَنْ مَاءٍ وَلَا یَرْکَبُھَا اَحَدٌ۔ قَالَ وَقِیلَ السَّائِبَۃُ لَا تَکُونُ اِلَّا مِنَ الْاِبِلِ کَانَ الرَّجُلُ یَنْذُرُ اِنْ بَرِئَ مِنْ مَرَضِہٖ اَوْقَدِمَ مِنْ سَفَرِہٖ لَیُسَیِّبَنَّ ھٰکَذَا فِی الْعَیْنِیْ۔

ترجمہ: "حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ سائبہ تمام قسم کے چوپایوں سے ہوتا تھا اور یہ بُتوں کے لیے نذر مانے ہوئے جانور ہیں، اُن کو چھوڑ دیا جاتا تھا" اور کسی چراگاہ پانی اور گھاس سے انہیں نہ روکا جاتا تھا اور نہ ان پر کوئی سوار ہوتا تھا۔ انہوں نے کہا ایک قول یہ بھی ہے کہ سائبہ صرف اونٹ کی قسم سے ہوتا تھا۔ آدمی نذر مانتا تھا کہ اگر وہ بیماری سے اچھا ہو جائے یا سفر سے واپس آجائے، تو وہ کوئی اونٹ بُتوں کے لیے نامزد کر کے چھوڑے گا۔"

ناظرین! قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح ہو گیا کہ بحیرہ، حام اور وصیلہ وغیرہ جانور حرام نہیں اور باوجود اس کے کہ مشرکین اُن کی نذر اپنے بُتوں کے لیے مانتے تھے اور اُن کو بُتوں کے لیے نامزد کرتے تھے، وہ قطعاً حلال ہیں اور ہرگز مَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِاللہ میں داخل نہیں، تو ایسی صورت میں اولیاء کرام کے لیے نذر (بمعنی ایصالِ ثواب) مانے ہوئے جانور کیونکر مَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِاللہِ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ حضرات اولیاء کرام کی فاتحہ، ایصالِ ثواب، نذر و نیاز (بمعنی ایصالِ ثواب) کے جانور قطعاً حلال ہیں اور انہیں حرام کہنا اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر افترا اور بہتان عظیم ہے۔

ارشادِ ربّانی: مَا لَکُمْ اَلَّا تَاْکُلُوْا مِمَّا ذُکِرَ اسْمُ اللہِ عَلَیْہِ۔

ترجمہ: "تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اُن جانوروں کو نہیں کھاتے، جن پر دبوقتِ ذبح، اللہ کا نام لیا گیا ہو۔"

اسی آیت کے ماتحت علامہ ابوسعود تفسیر ابوسعود جلد رابع ص۲۰۱ پر فرماتے ہیں:

اَنکَرَ لِاَن یَکُونَ لَهُم شَیئٌ یَدعُوهُم اِلَی الاِجتِنَاب عَن اَکلِ مَا ذُکِرَ عَلَیهِ اِسمُ اللّٰهِ تَعَالٰی مِنَ البَحَائِرِ وَالسَّوَاب وَنَحوِهَا۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے اس بات پر انکار فرمایا ہے کہ ان میں کوئی ایسی بات پائی جائے جس کی وجہ سے وہ اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانوروں کو نہ کھائیں۔

ذبیحہ کے حرام و حلال ہونے میں حال اور نیت ذابح کا اعتبار ہے

ذبیحہ کے حرام یا حلال ہونے میں مالک کی نیت یا حال کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ ذابح کے حال و قول اور نیت کا اعتبار ہوتا ہے۔ مثلاً اگر مسلمان کا جانور کوئی مجوسی ذبح کرے تو وہ حرام ہو گیا، اگرچہ مالک مُسلم تھا اور مجوسی کا جانور اگر مسلمان بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، تو حلال ہو جائے گا، اگرچہ مالک مشرک تھا۔ یا زید کا جانور عمر ذبح کرے اور قصداً تکبیر نہ کہے تو وہ حرام ہو گیا، اگرچہ مالک برابر کھڑا سو بار بسم اللہ اللہ اکبر کہتا رہے ذبح کرنے والا اگر تکبیر سے ذبح کرے تو حلال، اگرچہ مالک ایک بار بھی نہ کہے۔

اسی طرح اگر ذابح نے خاص اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے ذبح کیا، اگرچہ مالک کی نیت کسی غیر اللہ کی تھی، تو حلال ہے۔ اسی طرح اگر ذابح نے بسم اللہ اللہ اکبر کی بجائے باسمِ لات کہہ کر ذبح کیا، اگرچہ مالک کی نیت خاص اللہ تعالیٰ کی تھی، پھر بھی حرام ہو جائے گا۔ تمام صورتوں میں حال ذابح کا اعتبار ماننا اور اس شکلِ خاص میں انکار کر جانا محض تحکم باطل ہے جس پر شرعِ مطہر سے اصلاً دلیل نہیں۔

اسی لیے فقہائے کرام نے اس جزی کی خاص طور پر تصریح فرمائی ہے کہ مثلاً مجوسی نے اپنے آتش کدہ یا مشرک نے اپنے بتوں کے لیے مسلمان سے بکری ذبح کرائی اور اُس نے تکبیر کہہ کر ذبح کی، حلال ہے، کھائی جائے، اگرچہ یہ بات مسلم کے حق میں مکروہ ہے۔

فتاوٰی عالمگیری، فتاوٰی تاتارخانیہ وجامع الفتاوٰی میں ہے:

مُسلمٌ ذبح شاۃ المجوسی لبیت نارھم او الکافر لاٰلِھتھم توکل لِاَنّہ سمّی اللّٰہ تعالٰی ویکرہ لِلمُسلم

ترجمہ: مجوسی کی بکری جو اُس نے بیت نار کیلئے مقرر کی تھی یا کافر کی بکری جو اُس نے معبودانِ باطلہ کے لیے مقرر کی تھی۔ مسلمان نے ذبح کی اُسکا کھانا جائز ہے کیونکہ اُس نے اس پر اللہ کا نام لیا ہے۔ مسلمان کیلیے مکروہ ہوگی

پھر مسلمان ذابح کی نیت بھی وقتِ ذبح کی معتبر ہے، اس سے قبل و بعد کا اعتبار نہیں، ذبح سے ایک آن پہلے تک خاص اللہ عزوجل کے لیے نیت تھی۔ ذبح کرتے وقت غیرِ خدا کا نام لیا، ذبیحہ حرام ہوگیا۔ وہ پہلے والی نیت کچھ نفع نہ دے گی۔ یُوں ہی اگر ذبح سے پہلے غیر کے لیے ارادہ تھا، مگر ذبح کرتے وقت اللہ تعالٰی کے لیے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا تو ذبیحہ حلال ہو گیا۔ یہاں وہ پہلی نیت کچھ نقصان نہ دے گی۔

ردالمحتار میں ہے: اعلم ان المدار علی القصد عند ابتداء الذبح۔

ترجمہ: معلوم ہو کہ دارومدار ابتداء ذبح کے وقت ارادہ کی ہے

غرض ہر عاقل جانتا ہے کہ تمام افعال میں اصل نیت متقارنہ ہے۔ نماز سے پہلے خدا تعالٰی کے لیے نیت تھی تکبیر کہتے وقت دکھاوے کے لیے پڑھی، قطعاً مرتکب کبیرہ ہوا، اور نماز ناقابل قبول۔ اور اگر دکھاوے کے لیے اُٹھا، نیت باندھتے وقت تک یہی قصد تھا لیکن نماز شروع کرتے وقت قصد خالص ربِ عزوجل کے لیے کرلیا تو بلاشبہ وہ نماز قبول ہوگئی۔

خلاصہ کلام یہ کہ ذبح سے پہلے کی شہرتِ پکار کا کچھ اعتبار نہیں، نہ نفع دے نہ نقصان۔ خصوصاً جب پکارنے والا ذابح نہ ہو، تو اسے اس باب میں کچھ دخل نہیں۔ اعتبار صرف ذابح کی ذبح کرنے کے وقت نیت کا ہے۔

مجازی طور پر اضافت یا نسبت سے کوئی چیز حرام نہیں ہوتی

بعض کم فہم لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کسی چیز کی نسبت مجازی طور پر بھی غیر اللہ کی طرف کر دی جائے، تو پھر بھی وہ حرام ہو جاتی ہے جیسے کوئی کہے کہ پیران پیر کا بکرا۔ یا معصوم شاہ کی گائے ۔ اور اُس کا ارادہ یہ ہو کہ میں ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت پیرانِ پیر صاحب یا معصوم شاہ کے ایصالِ ثواب کے لیے غربا کو کھلاؤں گا تو پھر بھی وہ مشرک ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ قرآن و حدیث کے مخالف ہے۔

اضافت کو ادنیٰ علاقہ کافی ہوتا ہے۔ ظہر کی نماز، مسافر کی نماز، امام کی نماز، مقتدی کی نماز، عید کی نماز، بیمار کی نماز، پیر کے دن کا روزہ، اونٹوں کی زکوٰۃ، کعبہ کا حج۔ جب ان اضافتوں اور نسبتوں سے نماز، روزہ وغیرہ میں کفر و شرک اور حرمت تو درکنار، کراہت بھی نہیں آتی، تو پیرانِ پیر کا بکرا یا معصوم شاہ کی گائے کہنے سے یہ خدا تعالیٰ کے حلال کیے ہوئے جانور کیوں جیتے جی حرام اور مُردار ہو گئے۔ یہ شرع مطہرہ پر سخت جرات ہے۔ نماز، روزہ کی نسبت غیر اللہ کی طرف خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے۔ دیکھیے حدیث پاک میں آتا ہے؛

ان احب الصّیام الی اللہ تعالیٰ صیام داود واحب الصّلوٰۃ الی اللہ عزوجل صلوٰۃ داوٗد

ترجمہ: بے شک سب روزوں میں پیارے اللہ تعالیٰ کو داؤد علیہ السلام کے روزے ہیں اور سب نمازوں میں پیاری نماز داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔

علماء کرام نے فرمایا ہے کہ مستحب نمازوں میں سے مستحب نماز ماں باپ کی نماز ہے:

ردالمحتار میں ہے:

من المندوبات صلوٰۃ التوبۃ وصلوٰۃ الوالدین

(یعنی مستحب نمازوں میں صلوٰۃِ توبہ، اور صلوٰۃِ والدین ہے)

غیر اللہ کی طرف اضافتِ مجازی اور اضافتِ حقیقی کا فرق

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

لعن اللہ من ذبح لغیر اللہ (رواہ المسلم والنسائی)

خدا کی لعنت ہے اُس پر جو غیر خدا کے لیے ذبح کرے۔

اب اس حدیثِ پاک سے کئی امور ثابت ہوتے۔ ایک تو یہ کہ فقط غیر اللہ کا نام پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا، بلکہ وقتِ ذبح غیر اللہ کا نام لینے سے کوئی چیز حرام و ناجائز ہوتی ہے، ورنہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم مَن ذبح لِغیر اللہ کی بجائے من ذکر اسم لغیر اللہ فرماتے —— اور ساتھ ہی اس حدیث پاک سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ غیر اللہ کا نام لیا جائے، اُن کو مستقل طاقتوں کا مالک سمجھتے ہوئے یا اُن کو اپنا معبود سمجھتے ہوتے ایسا کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔

دوسری حدیث پاک ہے، من ذبح لضیفہ ذبیحۃ کانت فداءہ من النار (جو اپنے مہمان کے لیے جانور ذبح کرے، وہ ذبیحہ اس کا فدیہ ہو جائے گا آتشِ دوزخ سے)

تو معلوم ہوا کہ ذبیحہ میں غیر کی نیت اور اُس کی طرف نسبت مطلقاً کفر کیا حرام بھی نہیں، بلکہ حرام و ناجائز اُس وقت ہے جب وہ غیر اللہ کی عبادت کی نیت کرے۔ اگر کسی جانور کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے اور مہمان کے اکرام کی نیت کرے، تو باعثِ ثواب ہے۔ اسی طرح بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے اور کسی ولی کے ایصالِ ثواب کی نیت کرے، تو پھر بھی باعثِ ثواب ہے۔

ذبیحہ پر غیر اللہ کی نیّت کا حکم

فقہائے کرام فرماتے ہیں مطلقاً نیتِ غیر کو موجبِ حرمت جاننے والا سخت جاہل اور قرآن وحدیث وعقل کا مخالف ہے۔ آخر قصاب کی نیت تحصیل نفع دینا اور ذبائح شادی کا مقصود برات کو کھانا دینا ہے۔ نیّتِ غیر تو یہ بھی ہوئی۔ تو کیا یہ سب ذبیحے حرام ہو جائیں گے؟ یوں ہی مہمان کے واسطے ذبح کرنا درست و بجا ہے کیونکہ مہمان کا اکرام عین اکرامِ خدا ہے۔

صاحبِ دُرِّالمختار ؒ نے فرمایا:

ذبح للضیف لا یحرم لانه سنة الخلیل واکرام الضیف اکرام اللّٰه تعالیٰ۔ (مہمان کے لیے جانور ذبح کیا ہوا حرام نہ ہوگا، کیونکہ یہ سنّتِ ابراہیمی ہے اور مہمان کا اکرام اللہ تعالیٰ کا اکرام ہے۔

صاحبِ رَدّ المحتار ؒ نے اسی کے تحت فرمایا ہے:

قال البزازی ومن ظن انه لا یاکل لانه ذبح لاکرام بنی اٰدم فیکون کانه اهل به لغیر اللّٰه فقد خالف القراٰن والحدیث والعقل فانه لا ریب ان القصاب یذبح للربح ولو علم انه یخسر لا یذبح فیلزم لهذا الجاهل ان لا یاکل ما ذبحه القصاب وما ذبح للولائم والاعراس والعقیقة۔

ترجمہ: "بزازی نے کہا جو اس مہمان کے ذبیحہ کو یہ گمان کرے گا کہ یہ اس وجہ سے حلال نہیں کہ بنی آدم کے اکرام کے لیے ذبح کیا گیا ہے۔ پس ما اهل به لغیر اللّٰه میں داخل ہو گیا۔ پس یہ گمان کرنے والا قرآن وحدیث وعقل کا مخالف ہوگا، کیونکہ اس میں شک نہیں کہ قصاب نفع کے لیے جانور ذبح کرتا ہے۔ اگر وہ یہ جانتا کہ نفع نہ ہوگا، نقصان ہوگا

ذبح نہ کرتا۔ پس اس گمان کرنے والے جاہل پر لازم ہے کہ قصاب کے ذبیحہ کو اور اُن ذبیحوں کو جو ولیموں اور شادیوں اور عقیقوں کے لیے کیے جاتے ہیں نہ کھائے۔"

علماء کرام نے صراحتًا ارشاد فرمایا کہ مطلقًا نیت و نسبتِ غیر کو حرمت کا سبب ٹھہرانا اور ما اھلّ بہ لغیر اللہ میں داخل کرنا صرف جہالت ہی نہیں، بلکہ جنون و دیوانگی اور عقل و شرع دونوں سے بیگانگی ہے۔

جب دنیاوی نفع کی نیت ذبیحہ کی حلت میں شرعًا خلل انداز نہیں ہوتی ہے تو فاتحہ و ایصالِ ثواب کی نیت کیسے خلل ڈالے گی۔ جب اکرامِ مہمان اکرامِ خدا ٹھہرا تو پھر اکرامِ اولیاء تو بطریقِ اولیٰ اکرامِ خدا ٹھہرے گا۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر کوئی شخص پیرانِ پیر کا بکرا یا معصوم شاہ کی گائے کہے اور اُن جانوروں کے متعلق اُس کا قصد یہ ہو کہ میں انہیں بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر ذبح کر کے مذکورہ بالا اولیاء کرام کے ایصالِ ثواب کے لیے غرباء میں تقسیم کروں گا، تو اس میں ہرگز کوئی کفر و شرک نہیں ہے اور ایسے کرنے والے پر کفر و شرک کا فتویٰ لگانے والا خود گمراہ ہے۔

کسی چیز کی نسبت غیر اللہ کی طرف ایصالِ ثواب کے طور پر کرنا جائز ہے

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جلیل القدر صحابی ہیں۔ انہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ! میری ماں فوت ہو گئی ہے، اُس کے واسطے کون سا صدقہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: پانی۔ یہ سُن کر حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کنواں کھدوایا اور کہا یہ ھٰذِہٖ لِاُمِّ سَعْدٍ (یہ سعد کی ماں کے لیے ہے) اگر کنوئیں کی نسبت غیر اللہ یعنی سعد کی ماں کی طرف کرنے سے کنواں حرام نہیں ہو جاتا، تو اسی طرح اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یہ سبیل امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے یا یہ بکرا یا گائے پیرانِ پیر صاحب کی ہے اور مراد اُن بزرگانِ دین کے لیے ایصالِ ثواب ہو تو وہ سبیل اور

وہ بکرا اور گائے کیوں حرام ہو جاتے ہیں۔

جیساکہ بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ پیرانِ پیر صاحب کا بکرا یا امام حسین رضی اللہ عنہ کی سبیل کہنے سے وہ حرام اور مُردار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو یہ چاہیے کہ اب وہ یہ فتویٰ بھی دیں کہ "سعد کی ماں کا کنواں" کہنے سے اُس کنوئیں کا پانی بھی حرام ہو گیا۔ اور وہ کنواں جس سے پانی سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام نے پیا، اُس پر حرام کا فتویٰ لگا کر ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں یا پھر اس غلط عقیدے سے توبہ کر کے اہلِ سنت میں شامل ہو جائیں۔

نذر و نیاز

نذر و نیاز کے متعلق عقیدہ اہلِ سُنّت

نذر کے معنی دو ہیں، شرعی اور عُرفی۔ نذر شرعی عبادت ہے اور عبادت کسی غیر اللہ کے لیے جائز نہیں۔ اس لیے شرعی معنی میں تو نذر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے علاوہ کسی اور کی نذر ماننا شرک ہے، لیکن عرفِ عام میں نذر شرعی معنوں میں استعمال نہیں ہوتی، بلکہ ایصالِ ثواب کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے اور یہ شرک نہیں۔

فتاوٰی ابی اللیث

النّاذر لغیر اللہ ان قصد بالنذر التقرب الی غیر اللہ وظنّ انہ یتصرف فی الامور کلّھا دون اللہ فنذرہ حرامٌ باطلٌ وارتدادہ ثابتٌ وان قصد بالنذر التقرب الی اللہ وایصال الثواب للاولیاء ویعلم انہ لاتتحرک ذرۃ الاّ

باذن اللہ ویجعل الاولیاء وسائل بینہٗ و بین اللہ فی حصول مقاصدہٖ فلا حرج فیہ وذبیحتہ حلالٌ طیبٌ۔

ترجمہ: "غیر اللہ کی نذر ماننے والے نے اگر اپنی نذر سے غیر اللہ کی طرف تقرب کا ارادہ کیا اور یہ گمان کیا کہ تمام امور میں میت ہی متصرف ہے نہ اللہ تعالیٰ، تو اس کی نذر حرام و باطل ہے اور اس کا مرتد ہونا ثابت ہے اور اگر اس نے نذر سے تقرب الی اللہ کا ارادہ کیا اور اولیاء اللہ کو ثواب پہنچانے کی نیت کی اور وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی ذرہ متحرک نہیں ہوتا اور وہ اولیاء اللہ کو اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان وسائل قرار دیتا ہے تاکہ اس کے مقاصد حاصل ہو جائیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اس کا ذبیحہ حلال و طیب ہے۔"

تقرّب اس جگہ تقرب سے مراد مطلق تقرب نہیں، بلکہ تقرب علیٰ وجہ العبادۃ ہے۔ شرح وہبانیہ اور درمختار میں ہے:

انا لانسیءُ الظنّ بالمسلم انہ یتقرّب الی الآدمی بھٰذا النحر۔

ہم کسی مسلمان کے حق میں ہرگز یہ بدگمانی نہیں کرتے کہ وہ اس فعل ذبح کے ذریعے کسی آدمی کا تقرب حاصل کرتا ہے۔"

ردالمختار جلد پنجم ص۲۱۸ پر اسی کے تحت ہے۔

ای علیٰ وجہ العبادۃ لانہ المکفر وھذا بعید من حال المسلم۔

یعنی تقرب علیٰ وجہ العبادۃ، اس لیے کہ تقرب علیٰ وجہ العبادۃ ہی موجب کفر ہے اور ایسا تقرب مسلمان کے حال سے دور ہے۔

پس ثابت ہوا کہ مطلق تقرب الی الآدمی موجب کفر نہیں، بلکہ صرف تقرب علیٰ وجہ العبادۃ موجب کفر ہے۔

نذرِ اولیاء کے متعلق علامہ رافعی کا فتویٰ

(تحریر مختار لرد المختار جلد اوّل ص۱۲۳)

نذرُ الزَّیتِ والشمع لِلاولیاء یُوقد عِند قبُورِهم تعظیمًا لهُم ومحبةً فیهم جائزٌ ایضًا لا ینبغی النهیٰ۔

تیل اور شمع کی نذر ماننا اولیاء اللہ کے لیے کہ وہ چراغ روشن کیے جائیں اُن کی قبروں کے نزدیک اُن کی تعظیم اور محبت کے لیے تو یہ بھی جائز ہے اور اس سے منع کرنا بھی مناسب نہیں۔

تفسیراتِ احمدیہ

زیر آیت: وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ

ومن هٰهُنا علم انّ البقرة المنذورة للاولیاء کما هو الرسم فی زماننا حلالٌ طیّبٌ۔

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ بیشک وہ گائے جس کی نذر اولیاء کے لیے مانی جاتے جیساکہ ہمارے زمانے میں رسم ہے، حلال و طیب ہے

طبقاتِ کبریٰ جلد دوم ص۶۷ میں امام شعرانی، سیدی شاذلی

سے نقل فرماتے ہیں:

یقول رأیت النبی صلی اللہ تعالیٰ وسلم فقال اذا کان لك حاجة واردت قضائها فانذر للنفیسة الطاهرة ولو فلسًا فانّ حاجتك تقضی۔

ترجمہ، امام شعرانی، سیدی شاذلی رحمہما اللہ کا قول نقل کرتے ہیں:

"وہ فرماتے تھے کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے تھے جب تجھے کوئی حاجت درپیش ہو اور تو اُس کے پورا ہونے کا ارادہ کرے تو نفیسہ طاہرہ کی نذر مان لے، اگرچہ ایک پیسہ ہی کیوں نہ ہو، بے شک تیری حاجت پوری ہو جائے گی۔"

معلوم ہوا کہ قضا حاجات کے لیے اولیاء کی نذر ماننا جائز ہے جو لوگ نذرِ اولیاء کو شرک قرار دیتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس نذر سے مراد نذرِ شرعی نہیں، بلکہ اسے بر بنائے عرف نذر کہا جاتا ہے اور اس ایصالِ ثواب اور ہدیہ کو نذر کہنا شرعاً جائز ہے۔

نذر اولیاء کے متعلق سیدی عبدالغنی نابلسی "حدیقہ ندیہ" میں فرماتے ہیں،

والنذر لھم بتعلیق ذٰلک علیٰ حصول شفاءٍ او قدومِ غائبٍ فانّہ مجازٌ عن الصدقۃ علی الخادمین لقبورھم۔

ترجمہ: "اولیاء اللہ کے لیے جو نذر مانی جاتی ہے اور اسے مریض کے شفا حاصل ہونے یا غائب کے آنے پر معلق کیا جاتا ہے، تو وہ نذر مجاز ہے اور اس سے اولیاء اللہ کے قبور پر خادمین کے لیے صدقہ کرنا مراد ہوتا ہے۔"

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا فرمان

شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے اپنے فتاویٰ عزیزی جلد اول ص۱۲۱ مطبوعہ دیوبند پر نقل کرتے ہیں:

"لیکن حقیقت ایں نذر آنست کہ اہدا ثواب طعام و انفاق و بذل مال بروحِ میت کہ امریست مسنون و از روئے احادیثِ صحیحہ ثابت است مثل ما ورد فی الصحیحین من حال ام سعد وغیرہ ایں نذر مستلزم می شود۔

پس حال این نذر آنست کہ اہدا ثواب ہذا القدر الی رُوح فلاں وذکرِ ولی برائے تعیین عملِ منذور است نہ برائے مصرف این نذر نزد ایشاں متوسلاں آں ولی مے باشند از اقارب وخدم وہم طریقاں وامثال ذٰلک وہمیں است مقصود نذر کنندگان بلاشبہ وحُکمہ انّہٗ صحیحٌ یجب الوفا بہ لِاَنّہٗ قربۃ معتبرۃٌ فی الشرع۔

ترجمہ: "اس نذر کی حقیقت یہ ہے کہ اس طعام وغیرہ کا ثواب میت کی رُوح کو پہنچایا اور یہ امر مسنون ہے اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے جیسے حضرت سعد کی والدہ کے کنوئیں کا ذکر صحیح بخاری و صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اس نذر کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پس اس نذر کا حاصل یہ ہے کہ اس طعام وغیرہ کا ثواب فلاں کو پہنچے۔ نذر میں ولی کا ذکر اس لیے نہیں کیا جاتا کہ وہ اس نذر کا مصرف ہے - اس کا مصرف تو اُس ولی قریبی رشتہ دار، خدامِ درگاہ اور ہم مشرب لوگ ہوتے ہیں۔ ولی کا نام صرف اس عمل کو متعین کرنے کے لیے لیا جاتا ہے۔ نذر کرنے والوں کا بلاشبہ یہی مقصد ہوا کرتا ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی نذر صحیح ہے اور اس کو پورا کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ ایسی طاعت ہے جو شرعاً معتبر ہے۔"

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وہابی دیوبندی حضرات کے نزدیک بھی مسلّم علماء راسخین میں سے ہیں۔ آپ کی اس ایمان افروز وضاحت کے بعد کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، لیکن مزید اطمینان کے لیے چند حوالے پیشِ خدمت اور کیے جاتے ہیں:

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (انفاس العارفین

صفحہ ۴۵ پر) اپنے والدِ محترم (شاہ عبدالرحیم صاحب) کا قول نقل کرتے ہیں:

"میرے والد محترم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب مخدوم شیخ اللہ دیہ ؒ کے مزار شریف کی زیارت کے لیے قصبہ ڈاسنہ میں تشریف لے گئے۔ رات کو ایک ایسا وقت آیا کہ اس حالت میں فرمایا کہ مخدوم صاحب ہماری ضیافت فرماتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کچھ کھا کر جانا، چنانچہ آپ اور آپ کے ساتھی مزار شریف پر رک گئے۔ اسی وقت ایک عورت سر پر طبق رکھے ہوئے جس میں چاول اور مٹھائی تھی آئی اور کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اگر میرا شوہر واپس آجائے، تو میں اسی وقت یہ کھانا مخدوم اللہ دیہ کی درگاہ پر بیٹھنے والوں کو پہنچاؤں گی۔ میرا شوہر اسی وقت آیا ہے تو میں نے منت پوری کی ہے۔"

شاہ رفیع الدّین محدّث دہلوی کا فرمان

شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے "رسالہ نذر" میں تحریر فرماتے ہیں:

"نذرے کہ ایں جا مستعمل می شود نہ بر معنی شرعی است چہ عرف آنست کہ پیش بزرگاں می برند۔ نذر و نیاز می گویند۔

ترجمہ: جو نذر کہ اس جگہ مستعمل ہوتی ہے، وہ اپنے معنی شرعی پر نہیں، بلکہ معنی عرفی پر ہے، اس لیے کہ جو کچھ بزرگوں کی بارگاہ میں لے جاتے ہیں اس کو نذر و نیاز کہتے ہیں۔"

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا فرمان

شاہ صاحب کا فرمان "تحفہ اثنا عشریہ" ص ۳۹۶ پر تحریر ہے:

"حضرت علی اور اُن کی اولاد پاک کو تمام افراد اُمّت پیروں، مُرشدوں

کی طرح مانتے ہیں اور تکوینی امور کو ان حضرات کے ساتھ وابستہ جانتے ہیں
اور فاتحہ اور درود و صدقات اور نذر و نیاز اُن کے نام کی ہمیشہ کرتے ہیں،
چنانچہ تمام اولیاء اللہ کا یہی حال رہا ہے۔"

شاہ عبدالعزیز صاحب کا ایک اور فرمان (فتاوٰی عزیزیہ ص۷۵)

"وہ کھانا جو حضرت امام حسن و حسین کی نیاز کے لیے پکایا جائے اور اس پر فاتحہ،
قُل اور دُرود شریف پڑھا جائے، وہ تبرک ہے اور اُس کا کھانا بہت اچھا ہے"

نذر و نیاز اکابرینِ دیوبند کی نظر میں

اب ہم اتمامِ حجت کے لیے مرشدِ علماء دیوبند حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی
رحمۃ اللہ علیہ جو کہ مولوی رشید احمد گنگوہی، مولوی محمد قاسم نانوتوی، مولوی اشرف علی تھانوی
اور مولوی احمد حسن کانپوری وغیرہ سب کے پیر و مرشد ہیں۔ یہ وہی حاجی صاحب ہیں،
جن کو علماء دیوبند مرشد العرب والعجم کہتے ہیں اور بانی دارالعلوم دیوبند مولوی محمد قاسم نانوتوی
نے انہیں کے متعلق کہا تھا: "حاجی صاحب صرف عالم ہی کیا، بلکہ عالم گر تھے" کا فتوٰی
نقل کرتے ہیں۔ حاجی صاحب کے ملفوظات "امداد المشتاق" میں جمع ہیں اور لُطف یہ کہ
ان کو جمع کرنے والے دیوبندیوں وہابیوں کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی ہیں۔

امداد المشتاق ص۹۲

حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:
"نذر و نیاز قدیم زمانہ سے جاری ہے، لیکن اس زمانہ کے لوگ انکار کرتے ہیں"

امداد المشتاق ص۹۲

"مولوی صادق الیقین صاحب فرماتے ہیں کہ جب مثنوی شریف ختم ہوگئی تو حاجی امداد اللہ صاحب نے حکم شربت بنانے کا دیا اور فرمایا اس پر مولانا روم صاحب کی نیاز بھی کی جائے گی۔ گیارہ گیارہ بار سورۃ اخلاص پڑھ کر نیاز کی گئی اور شربت بٹنا شروع ہوا۔ آپ نے فرمایا نیاز کے دو معنی ہیں ایک عجز و بندگی اور وہ سوائے خدا کے کسی کے واسطے نہیں ہے، بلکہ ناجائز اور شرک ہے ـــــ اور دوسرے خدا کی نذر اور ثواب خدا کے بندوں کو پہنچانا یہ جائز ہے، لوگ انکار کرتے ہیں اس میں کیا خرابی ہے؟"

امداد المشتاق ص۳۳

"بعض یارانِ طریقت نے حضرت ایشاں (حاجی امداد اللہ صاحب) کے لیے ایک مکان خریدا اور بطورِ خود اُس کی تعمیر کی اور حضرت ایشاں (حاجی امداد اللہ صاحب) کے نذر کیا۔"

مولوی رشید احمد گنگوہی دیوبندی کا قول

(فتاوٰی رشیدیہ جلد اول ص۱۴)

"جو اموات اولیاء کی نذر ہے، تو اُس کے اگر یہ معنی ہیں کہ ثواب اُن کی روح کو پہنچے، تو صدقہ ہے اور درست ہے اور اگر نذر بمعنی تقرب ان کے نام پر ہے تو حرام ہے۔"

تقرب کا معنی مولوی رشید احمد گنگوہی کی زبانی

(فتاوٰی رشیدیہ، جلد سوم ص۲۱)

"معنی تقرب یہ ہے کہ کسی سے نزدیکی اور ولایت حاصل کرنا کہ اس میں جملہ حوادث سے امن چاہے اور استقلالاً اُس سے نفع چاہے۔"

قارئین کرام! مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نذر اللہ تعالیٰ کی اور ایصالِ ثواب فلاں بزرگ کا مثلاً تو یہ جائز ہے۔ ہاں اگر کسی غیر اللہ یعنی کسی نبی یا ولی کو مستقل طاقتوں کا مالک یعنی ذاتی نفع نقصان کا مالک سمجھ کر اُس کی نذر مانے تو یہ شرک ہوگا، اور یہ تقرب الیٰ غیر اللہ ہوگا جیسا کہ تقرب کا معنی مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی نے بیان کیا ہے۔ تقرب کہتے ہی اسی کو ہیں کہ کسی کو ذاتی نفع و نقصان کا مالک سمجھ کر اُس کی نذر مانی جائے، تو آپ کو کوئی جاہل سے جاہل انسان بھی ایسا نہیں ملے گا جو کسی نبی یا ولی کو مستقل طاقتوں کا مالک سمجھتا ہو، بلکہ ہر مسلمان نذر اللہ کی مانتا ہے اور ایصالِ ثواب بزرگوں کے لیے کرتا ہے۔

مولوی اسماعیل دہلوی دیوبندی (صراطِ مستقیم صہ ۱۰۳)

"جو عبادت کہ مسلمان سے ادا ہو، اُس کا ثواب کسی فوت شدہ کے رُوح کو پہنچائے اور جنابِ الٰہی میں دُعا کرنا اُس کے پہنچانے کا طریقہ ہے اور یہ بہت بہتر اور مستحسن طریقہ ہے اور وہ شخص کہ جس کی رُوح کو ثواب پہنچایا جا رہا ہے۔ اگر اُس کے حقداروں میں سے ہے۔ اُس کے حق کے برابر ثواب پہنچانے کی خوبی بہت زیادہ ہوگی۔ پس امورِ مروّجہ یعنی اموات کے فاتحوں، عرسوں اور نذر و نیاز سے اس قدر امر کی خوبی میں کچھ شک و شبہ نہیں۔"

مقامِ غور: اب کیا فرماتے ہیں نام نہاد دیوبندی وہابی شاہ عبدالرحیم صاحب کے بارے میں جنہوں نے وہ نذر و نیاز کھائی جو ایک ولی اللہ کے مزار پر بطور چڑھاوے کے لائی گئی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بارے میں جنہوں نے اپنے والد ماجد کے فضائل و

کرامات میں اس کو نقل کیا ہے اور فرمایا کہ بزرگ کے نام کی نیاز کھانی جائز ہے اور
شاہ عبد العزیز صاحب کے بارے میں جو فرمار ہے ہیں کہ تمام اُمت اور جمیع اولیاء اللہ
اہل بیت کی نذر و نیاز کرتے ہیں اور امام حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی نیاز تبرک
ہے اور اپنے مولوی اسماعیل دہلوی کے بارے میں جو فرمار ہے ہیں کہ ہمارے پیر بھائیوں
نے مکان پیر صاحب کی نذر کیا، اور عارف باللہ حاجی امداد اللہ صاحب کے بارے
میں جو مولانا رُوم کی نیاز کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ طریقہ نذر و نیاز قدیم زمانہ سے جاری ہے
اور مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کے بارے میں جو فرمار ہے ہیں کہ اموات کی
نذر درست ہے جبکہ اُن کی رُوح کو ثواب پہنچانا مقصود ہو، آپ کے عقیدہ کے مطابق
وہ سب کے سب مُشرک ہوئے یا نہیں ؟
اور آپ لوگ (اپنے وضع کردہ کلیہ کے مطابق بننے والے) ان مشرکوں کو مسلمان
مان کر مُشرک ہوئے یا نہیں ؟

تعیّنِ یوم

تعیّنِ یوم کے متعلق صحیح عقیدہ

کسی نفلی عبادت کے لیے کسی مصلحت کے ماتحت وقت کا مقرر کر دینا دلائلِ
شرعیہ کی رُو سے جائز ہے بشرطیکہ مقرر کرنے والے کا یہ عقیدہ نہ ہو کہ اس وقت کے سوا یہ
عبادت قبول ہی نہیں ہوتی ۔ اور ہم اہل سنّت و جماعت کا یہی عقیدہ ہے۔ ہم اہل سنّت
و جماعت کسی نیک عمل کے لیے وقت اس لیے مقرر کرتے ہیں تا کہ وہ عمل ہمیشہ ہوتا رہے
کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے : احب الاعمال الی اللہ
ادومھا وان قلّ (یعنی خدا کے نزدیک محبوب ترین عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے، اگرچہ تھوڑا ہو

اور سہولتِ دوام کے پیشِ نظر کسی نیک کام کے لیے دن مقرر کر دینے سے وہ عمل ہرگز ناجائز نہیں ہو جاتا۔ ملاحظہ فرمایئے مرشدِ علماء دیوبند حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا فرمان فیصلہ ہفت مسئلہ ص۲؎

نفلی عبادت کے لیے اپنے اجتہاد سے وقت مقرر کرنے کے دلائل

کسی نفلی عبادت کے لیے اپنے اجتہاد سے وقت مقرر کرنا تو صحابہ کرام سے بھی ثابت ہے، لیکن یہ تعیینِ شرعی نہیں ہوتی۔

بخاری شریف، مسلم شریف میں یہ حدیث پاک موجود ہے:

کان عبد اللہ ابن مسعودٍ یذکر الناس فی کل خمیسٍ۔

ترجمہ "یعنی حضرت عبد اللہ ابن مسعود ہر جمعرات کے دن لوگوں کو وعظ فرمایا کرتے تھے۔"

مقامِ غور ہے کہ جمعرات کو وعظ کے لیے نہ خدا نے مقرر کیا ہے اور نہ محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے مقرر کیا ہے، بلکہ صحابئ رسول نے اپنے اجتہاد سے مقرر کرلیا ہے۔

بخاری شریف جلد دوم:

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

قال کانت فینا امرأۃٌ علیٰ اربعا فی مزرعۃٍ لہا سلق فکانت اذا کان یوم جمعہ تنزع اصول السلق فتجعلہ فی قدر ثم تجعل علیہ قبضۃً من شعیر تطبخہا فتکون اصول السلق عرقہ وکنّا ننصرف من صلوٰۃ الجمعہ فنسلم علیہا فتقرب ذالک الطعام الینا فنلعقہ وکنا نتمنّیٰ یوم الجمعۃ لطعامہا ذالک۔

ترجمہ: "ہمارے (مسلمانوں) میں ایک عورت تھی جو نالے کے پانی سے اپنے کھیت میں چقندر بوتی، تو جب جمعہ کا دن ہوتا تو چقندر کی جڑیں علیحدہ کر کے دیگچی میں ڈالتی اور اس پر جو ڈال کر تمام کو پکاتی، تو چقندر کی جڑیں اس میں گوشت کے قائم مقام ہوتیں۔ جب ہم جمعہ کی نماز سے فارغ ہوتے، تو ہم اس عورت پر السلام علیکم جا کر کہتے تو اس طعام کو وہ ہمارے سامنے قریب کر دیتی، تو ہم اس کو چاٹ چاٹ کر کھاتے اور ہر جمعہ کے دن ہم اس کھانے کے متمنی ہوتے۔"

بخاری شریف جلد اوّل ص۱۵۴:

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال لبلال عند صلوٰۃ الفجر یا بلال حدثنی بارجیٰ عمل عملتہ فی الاسلام فانی سمعت دف نعلیک بین یدی فی الجنۃ قال ما عملت عملاً ارجیٰ عندی انی لم اتطھر طھورا فی ساعۃ لیل او نھار الا صلیت بذلک الطھور ما کتب لی ان اصلی

ترجمہ: "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صبح کی نماز کے وقت فرمایا اے بلال! بتلاؤ تم نے اسلام میں ایسا کونسا عمل کیا ہے جس کے اجر کی تمہیں توقع ہے، کیونکہ میں نے جنت میں اپنے آگے تمہارے چلنے کی آہٹ سُنی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا اس سے زیادہ میرے نزدیک کوئی عمل لائق قبولیت نہیں ہے کہ میں دن یا رات میں جب بھی وضو کرتا ہوں، تو اس وضو سے نماز پڑھتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے مقرر فرمائی ہے۔"

قارئینِ کرام! مقام غور ہے نفلی نماز کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے لیکن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اجتہاد سے وضو کے بعد نفل پڑھنے کو مقرر کر لیا تھا

اس سلسلے میں انہوں نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے دریافتِ حال کے بعد یہ نہیں فرمایا کہ تم نے اپنی طرف سے نوافل کے لیے یہ وقت کیوں مقرر کرلیا۔ نفلی عبادت کے لیے اپنی طرف سے وقت مقرر کرلینا اور اس پر دوام کرنا اگر بدعت و گمراہی ہے تو حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا رد کیوں نہیں فرمایا۔ رد کرنا تو دُور کی بات ہے حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اس عمل کی تحسین کرکے اُمت کے لیے یہ رہنمائی فرمادی کہ نفلی عبادات کے لیے اپنے اجتہاد سے وقت معین کرنا جائز ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

ویستفاد منہ جواز الاجتہاد فی التوقیت للعبادۃ لان بلالا توصل الی ما ذکرنا بالاستنباط فصوبہ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

ترجمہ" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ (نفلی) عبادات کے لیے اپنے اجتہاد سے وقت معین کرنا جائز ہے، کیونکہ بلال (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے وضو کے بعد نوافل اپنے استنباط سے معین کیے تھے اور حضورِ اکرم صلی اللہ وسلم نے اسے درست قرار دیا۔"

جس طرح نوافل پڑھنے کے لیے شرعاً کوئی وقت مقرر نہیں ہے، لیکن حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر وضو کے بعد نوافل پڑھنے کا التزام کیا اور جائز قرار پایا۔ اسی طرح مُردوں کے ایصالِ ثواب کے لیے شرعاً کوئی وقت مقرر نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص محض سہولتِ دوام کے لیے گیارہویں، جمعرات، چالیسواں یا عُرس والے دن کو مقرر کرلے تو یہ کس طرح بدعت قرار پائے گا یا اگر اذان سے قبل یا بعد میں دُرود شریف پڑھنا مقرر کردے، تو کیونکر بدعت قرار پائے گا۔

صحیح بخاری جلد اوّل ص۱۵۹

کان النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یاتی مسجد قبا کل سبتٍ ماشیًا و راکبا وکان عبد اللہ ابن عمر یفعلہ۔

ترجمہ: ”حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ہر ہفتہ کے دن مسجدِ قبا پیدل یا سواری پر جایا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ ابن عمر بھی ہفتہ کے دن مسجدِ قبا کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے“

علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری جلد سوم ص۳۱۲ پر اس حدیث کے تحت اس حدیث کے فوائد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وفی ھٰذا الحدیث علی اختلاف طرقہ دلالۃ علی جواز تخصیص بعض الایام ببعض الاعمال الصالحۃ والمداومۃ علیٰ ذٰلک۔

ترجمہ: ”اس حدیث میں باوجود اختلاف طرق کے اس بات پر دلالت ہے کہ بعض اعمالِ صالحہ کی ادائیگی کو بعض ایام کے ساتھ خاص کر لینا اور اس پر عمل میں دوام کرنا جائز ہے۔“

علامہ بدرالدین عینی حنفی عمدۃ القاری جلد ہفتم ص۲۵۹ پر فرماتے ہیں:

فیہ دلیل علیٰ جواز تخصیص ببعض الایام بنوع من القرب وھو کذٰلک الّا فی الاوقات النھی عنھا کالنھی عن تخصیص لیلۃ الجمعۃ بقیام من بین اللیالی او تخصیص یوم الجمعۃ بصیام من بین الایام۔

ترجمہ: ”اس حدیث پاک میں اس بات پر دلیل ہے کہ بعض ایام کو بعض عبادات کے ساتھ خاص کر لینا جائز ہے اور یہ امر ایسا ہی ہے سوا ان چیزوں کے جن کے بارے میں نہی وارد ہے جیسے جمعہ کی رات کو قیام کے لیے یا جمعہ کے دن کو روزے کے لیے خاص کر لینا کیونکہ اس تخصیص سے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلّم نے منع فرمایا ہے“

مولوی اشرف علی تھانوی دیوبندی کا مندرجہ بالا حدیث کے متعلق قول (بوادر النوادر ص ۴۵۷)

ہر دو حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی مقصود مباح یا کسی طاعت کے لیے تعین یوم اگر باعتقاد قربت نہ ہو، بلکہ کسی مباح مصلحت کے لیے ہو جائز ہے جیسے مدارسِ دینیہ میں اسباق کے لیے گھنٹے متعین ہوتے ہیں اور اگر باعتقاد قربت ہو منہی عنہ ہے۔ پس عرس میں جو تاریخ متعین ہوتی ہے۔ اگر اس تعیین کو قربت نہ سمجھیں بلکہ اور کسی مصلحت سے یہ تعیین ہو، مثلاً سہولت اجتماع تاکہ تداعی کی صعوبت یا بعض اوقات اس کی کراہت کے شبہ سے مامون رہیں اور خود اجتماع اس مصلحت سے ہو کہ ایک سلسلہ کے احباب باہم ملاقات کر کے حب اللہ کو ترقی دیں اور اپنے بزرگوں کو آسانی اور کثیر مقدار میں جو کہ اجتماع سے حاصل ہے، ثواب پہنچانا ہے، بے تکلف میسر ہو جائے نیز اس اجتماع میں طالب علموں کے لیے اپنے شیخ کا انتخاب آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تو ظاہری مصالح ہیں جو مشاہد ہیں یا کوئی باطنی مصلحت داعی ہو، جیسا میں نے بعض اکابر اہلِ ذوق سے سنا ہے کہ میت کو اپنے یوم وفات کے عدد سے وصولِ ثواب کے انتظار کی تجدید ہوتی ہے اور یہ مصلحت محض کشفی ہے جس کا کوئی مکذب عقلی یا نقلی موجود نہیں، اس لیے صاحبِ کشف کو یا اس صاحب کشف کے معتقد کو بدرجہ ظن اس کی رعایت کرنا جائز ہے، البتہ جزم جائز نہیں۔ بہر حال اگر ایسے مصالح سے یہ تعیین ہوتی، تو فی نفسہٖ جائز ہے۔

نوٹ: بہر حال تھانوی صاحب کی اس عبارت سے اہلِ فہم کے لیے اس پر کافی روشنی موجود ہے کہ جو عبادات عموم اور اطلاق کے ساتھ مشروع ہیں۔ اُن کو کسی مناسبت سے کسی خاص دن یا کسی خاص وقت میں ادائیگی کے لیے معین کر لینا جائز ہے۔

مُرشدِ علماء دیوبند حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان — (فیصلہ ہفت مسئلہ ص۲۰)

"اب رہا تاریخ مقرر کرنا تو یہ بات تجربے سے معلوم ہوتی ہے جو کام کسی خاص وقت میں کیا جاتا ہے، وہ اُس وقت بھی یاد آجاتا ہے اور ضرور انجام پاتا ہے نہیں تو سالہا سال گزر جاتے ہیں کبھی اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ اس قسم کی مصلحتیں ہر بات میں ہیں۔ بہر حال اس قسم کی مصلحتیں اگر ایک خاص شکل اختیار کرنے کا باعث ہوں تو کچھ مضائقہ نہیں۔"

قارئین کرام! نفلی عبادات کے لیے اپنے اجتہاد سے وقت کو صحابۂ کرام نے بھی مقرر فرمایا ہے اور امتِ مسلمہ میں سے کسی نے آج تک اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ خود حکیم الامت علماء دیوبند مولوی اشرف علی تھانوی اور مرشدِ علماء دیوبند حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے بھی بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر نفلی عبادات کے وقت مقرر کرنے کو جائز کہا ہے۔

مقامِ غور بعض لوگ یہ کہتے ہیں مُردوں کو جانی و مالی عبادات کا ثواب ویسے تو ہر وقت پہنچتا ہے، لیکن اگر ایصالِ ثواب کے لیے وقت مقرر کر دیا جائے جیسے تیجہ، جمعرات، چالیسواں، گیارہویں اور عُرس وغیرہ حرام و ناجائز ہے حالانکہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی احادیثِ مبارکہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مُردے کو جانی و مالی عبادات کا ثواب سال کے تمام دِنوں میں پہنچتا ہے۔ مقامِ غور ہے کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم تو فرمائیں کہ سال کے جس دن مرضی ہو مُردے کے لیے ایصالِ ثواب ہو سکتا ہے، لیکن گیارہویں، جمعرات، تیسرے دن، چالیسویں دن، ثواب نہیں پہنچتا، تو گویا وہ بوجہ جہالت سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کو چیلنج کرتا ہے۔

سراسر الزام بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ایصالِ ثواب کے لیے دن مقرر بھی کر دیا جائے، تو اتنی خرابی نہیں ہوتی، لیکن خرابی یہ ہوتی ہے کہ اہلسنت کا عقیدہ ہے

ہے کہ دسویں محرم، گیارہویں، تیجہ، چالیسویں کے سوا مُردے کو ثواب بالکل پہنچتا ہی نہیں۔

قارئینِ کرام! یہ سراسر الزام و بہتان ہے۔ اہلِ سنّت کے علماء تو بجائے خود رہے عوام الناس میں سے بھی کسی کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہوتا کہ مقررہ دن کے سوا ثواب نہیں پہنچتا اور اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ عام لوگ سیدنا غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی گیارہویں، گیارہ تاریخ کے بجائے ۱۳ یا ۱۴ کو تقسیم کر رہے ہوتے ہیں اور ہم اہلِ سنّت وجماعت تو برملا کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھ کر کہ مقررہ ایام کے سوا، مُردوں کو جانی و مالی عبادات کا ثواب پہنچتا ہی نہیں، صدقہ و خیرات کرے، تو یہ ناجائز و حرام ہے، کیونکہ اس طرح تو یہ تعیینِ لغوی کی بجائے تعیینِ شرعی ہو جائے گی، جس کا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بغیر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

قابلِ توجّہ: اگر کسی بھی نیک عمل کے لیے تاریخ معیّن کر دینے سے وہ عمل ضائع ہو جاتا ہے تو پھر دیوبندی وہابی حضرات مختلف کاموں کے لیے خود تاریخ معیّن کیوں کرتے ہیں:

(۱) ہر سال ۲۷ رمضان المبارک کو مقررہ تاریخ پر جلسہ کرتے ہیں۔

(۲) جلسوں کے لیے تاریخ معیّن کرتے ہیں۔

(۳) رائے ونڈ کے سالانہ تبلیغی اجتماع کے لیے تاریخ معیّن کرتے ہیں۔

(۴) مدرسوں میں اسباق کے لیے وقت مقرر کرتے ہیں

(۵) جشن صد سالہ دیوبند کے لیے بھی تاریخ معیّن کی گئی تھی۔

اگر اُن کے لیے مختلف نیک کاموں کے لیے تاریخ مقرر کرنے میں کوئی خرابی نہیں، تو پھر اگر ہم کسی نیک عمل کے لیے تاریخ معیّن کر دیں تو اُن کو اس میں بدعت کا دائمہ کیوں پڑتا ہے۔

عُرس

اولیاء اللہ کے یومِ وصال کو عُرس کہتے ہیں۔
اولیاء اللہ کے یومِ وصال کو عُرس کیوں کہتے ہیں؟ اس کے ثبوت میں ہم مشکوٰۃ شریف
کے کتاب الجنائز سے چند حدیثیں نقل کرتے ہیں۔

(۱) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب مومن کی وفات کا وقت قریب آتا ہے تو اُس
کو رضائے الٰہی اور عنایات وبخشش کی خوشخبری دی جاتی ہے۔

فَلَيْسَ شَيْئٌ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا اَمَامَه فَاَحَبَّ
لِقَاءَ اللهِ وَاَحَبَّ اللهُ لِقَاءَه (مشکوٰۃ شریف)

"اور وہ خوشخبری کو پاکر دولت وزینتِ دُنیا کے مقابلے میں آئندہ کی ہر چیز محبوب
رکھنے لگتا ہے، پس وہ مومن اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور دیدار کا مشتاق ہوجاتا ہے اور
خدا تعالیٰ اس کی ملاقات کو دوست رکھتا ہے۔" ؎

خوب تر زیں در جہاں چہ بود کار
دوست بدست رود و یار بیار

(۲) حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: العبد المومن يستريح من نصب
الدنيا واذاها الى رحمة الله (مشکوٰۃ شریف)

"یعنی بندہ مومن مرنے کے سبب سے دُنیا کی تکالیف اور اُس کی ایذا سے راحت و
آرام پاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی رحمت کی طرف جاتا ہے۔" جیسا کہ امیر مینائی کہتے ہیں ؎

رُوح جنت میں ہے بدن اندر مزار کے
کشتی ہماری ڈوب گئی پار اُتار کے

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: تحفة المؤمن الموتُ۔ (رواہ البیہقی فی شعب ایمان) "یعنی مومن کے حق میں مرنا بمنزلہ تحفہ کے ہے" اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیونکہ اس کے سبب سے انسان ثواب اور دارِ آخرت کو پہنچتا ہے

بڑے ناداں ہیں جو لوگ ڈرتے ہیں امیر اس سے
اجل تو نام ہے اک زندگانی کے نگہباں کا

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قبضِ رُوح کے وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ اگر وہ مردِ مومن صالح اور پرہیز گار ہوتا ہے تو کہتے ہیں: اخرجی ایتها النفس الطیبة کانت فی الجسد الطیّب اخرجی حمیدةً و اَبشِری بروحٍ وریحانٍ وربٍّ غیر غضبان فلا تزالُ یقال لها ذٰلک (رواہ ابن ماجہ)

یعنی اے جانِ پاک جو پاک جسم میں تھی نکل اور خدا تعالیٰ کے رزق، راحت اور ملاقات سے خوش ہو۔ پس وہ رُوح نکلتی ہے اور اس سے ایسی خوشبو آتی ہے جیسے کستوری و مشک وغیرہ۔ پھر وہ رحمت کے فرشتے اسی طرح نہایت ادب و احترام اور خوشی اور خرمی سے اس کو آسمان کی طرف لے جاتے ہیں اور آسمان کے دربان یہ معلوم کر کے کہ یہ سعید رُوح ہے۔ اس طرح اس کو خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور عیش و آرام جنت کی خوشخبری دیتے ہیں، حتیٰ کہ اسی طرح وہ رُوح خاص عرشِ معلیٰ تک پہنچ جاتی ہے۔

مزے جو مرنے کے عاشق بیاں کبھی کرتے
مسیحا و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

فائدہ: مظاہرِ حق شرح مشکوٰۃ شریف جلد دوم ص۳۷ میں اس حدیث کے تحت لکھا ہے:

"رُوحِ مومن زمین و آسمان میں سیر کرتی ہے۔ جنت کے میوے کھاتی اور جہاں دل چاہتا جاتی ہے اور عرش معلّٰی کی قندیلوں میں جگہ پکڑتی ہے اور اس کو اپنے بدن کے ساتھ بھی اس طرح کا تعلق رہتا ہے کہ وہ اپنی قبر میں قرآن شریف اور نماز پڑھتا ہے۔ چین کرتا اور مانند دولہا کے سوتا ہے اور اپنے حسب مقام اور مرتبہ جنت میں اپنی منزل دیکھتا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(۵) مُسند امام احمد اور نسائی شریف میں یہ حدیث پاک موجود ہے کہ بوقتِ وصال مومن رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑا لاتے ہیں اور رُوحِ مومن کو مبارکباد اور خوشخبری دیتے ہیں۔ پس رُوحِ مومن خوشبو، مشک اور کستوری کی طرح نکلتی ہے اور فرشتے اُس کو دست بدست تبرکاً اور تعظیماً آسمان کی طرف لے جاتے ہیں، آسمان سے فرشتے کہتے ہیں:

ما اطیب ھذہ الریح التی جاء تکم من الارض فیاتون بہ ارواح المؤمنین فَلَھُمْ اَشَدُّ فرحًا بِہٖ من اَحَدِکُمْ وغائِبِہٖ یَقْدَمُ علیہ

یعنی کتنی عمدہ خوشبو ہے جو زمین سے آئی ہے۔ پھر ارواحِ مومنین کے پاس اُس کو لاتے ہیں اور تمام رُوحیں اُس کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوتی ہیں کہ جس طرح کسی سفر میں گئے ہوئے آدمی کی واپسی پر اُس کے گھر والے خوش ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اُسے خداوند تعالیٰ کے حضورِ خاص میں لے جایا جاتا ہے ؎

رُوحیں کشتوں کی گلے ملتی ہیں شاداں ہو کر

عید سے عید ہوئی یار پہ قربان ہو کر

علامہ اقبال علیہ الرحمہ کہتے ہیں ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم!

چُوں مرگ آید تبسم برلبِ اوست

(۶) خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندے کی کتاب علیین میں لکھو اور اس کو زمین کی طرف لوٹاؤ اور پھر اُس کی رُوح جسم میں واپس آجاتی ہے اور منکر نکیر اس سے سوال کرتے ہیں، وہ نہایت عمدہ طریقے سے سوالوں کے جواب دیتا ہے تو پروردگارِ عالم کی طرف سے ندا آتی ہے، صَدَقَ عَبْدِیْ یعنی میرے بندے نے سچ کہا اُس کے لیے جنتی فرش بچھاؤ اور اُس کو جنت کے لباس پہناؤ اور جنت کا دروازہ کھول دو۔ پھر اُس کو خوشبودار ہوا آتی ہے اور اُس کی قبر جہاں تک اُس کی نظر جاتی ہے کھُل جاتی ہے۔

(مشکوٰۃ شریف)

ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمہ کہتے ہیں ؎

تجھے کیا بتائیں اے ہم نشیں ہمیں موت میں جو مزا ملا

نہ ملا مسیحا و خضر کو وہ حیاتِ عُمرِ دراز میں

(۷) حضور پُرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ پھر اُس کے پاس ایک نہایت خوبصورت اور خوشبودار شخص آتا ہے اور بندۂ مومن کو ان الفاظ میں مبارکباد دیتا ہے:

اَبْشِرْ بِالَّذِیْ یَسُرُّكَ هٰذَا یَوْمُكَ الَّذِیْ كُنْتَ تُوْعَدُ۔

یعنی تجھ کو اس چیز کی بشارت دیتا ہوں کہ جو تجھے خوش کرے اور یہ وہ دن ہے جس کا تجھے دنیا میں وعدہ دیا جاتا تھا۔ پھر مومن اسے کہتا ہے کہ تو کون ہے کہ تو نہایت خوش و اور مبارک دینے والا ہے۔ وہ کہتا ہے میں تیرا نیک عمل ہوں جو تو نے دنیا میں کیا تھا (مشکوٰۃ)

(۸) بندہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر میں گھر واپس جا کر اپنے ا
بچوں، بیوی اور عزیز و اقارب کو خدا تعالیٰ کی اس کرم و بخشش اور بندہ نوازی کی خبر
دے آتا، تو یہ سن کر فرشتے اس سے نہایت ادب و حلم سے عرض کرتے ہیں:

نَم کنومۃ العروسِ الَّذی لَا یُوقِظُہ اِلَّا اَحَبُّ اَھلِہٖ (رواہ ترمذی)

ترجمہ: "سو جاؤ دُلہن کی طرح کہ اُس کو اپنے محبوب کے سوا کوئی نہ جگائے گا۔"

آمدم بر سرِ مطلب

"عُرس" کا لفظ اسی حدیث پاک سے ماخوذ ہے۔ عُرس کے لغوی معنی شادی اور جشنِ عروسی کے ہیں اور اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ کسی بزرگ کا یومِ وصال ہے کہ جس دن قرآن مجید پڑھ کر یا طعام و شیرینی غرباء و مساکین کو تقسیم کر کے اس کا ثواب اُس بزرگ کی رُوح کو بخشا جائے۔

بزرگانِ دین کے ایامِ وصال کو "عُرس" سے اس لیے منسوب کرتے ہیں کیونکہ اولیاء اللہ کے لیے اُن کے وصال کا دن یقیناً مسرت و انبساط کا دن ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا احادیث سے واضح ہے۔ بندۂ مومن دیدارِ خداوندی کا مشتاق ہوتا ہے۔ رحمت کے فرشتے اُسے مُبارک بادیاں دیتے ہیں اور اُس کے وصال سے خوش ہوتے ہیں۔ پروردگارِ عالم کی طرف سے اُسے خوشنودی اور سُرخروئی کا سہرا اور تاج ملتا ہے اور اللہ ربّ العزت جل شانہٗ کی بے انتہا رحمتیں اور برکتیں اُس پر نازل ہوتی ہیں۔ ارواحِ مؤمنین اُس سے اور وہ اُن سے مل کر خوش ہوتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں اور اُس سے کہا جاتا ہے، نَم کنومۃ العروس یعنی دُولہا کی طرح خواب ناز میں سو جا۔ پس اس عروسِ جنت کے یومِ وصال کو اس کا یومِ عُرس کہتے ہیں۔

عرس کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثبوت

بخاری شریف، تفسیر ابن جریر، تفسیر دُرِّ منثور، تفسیر کبیر اور ردالمختار میں یہ

حدیث پاک موجود ہے : عن انسٍ انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم کان یاتی قبور الشھداء علیٰ راسِ کلِّ حولٍ فیقول سلامٌ علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار والخلفاء الاربعۃ ھٰکذا یفعلون۔

ترجمہ: "حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہر سال کے شروع میں شہیدوں کی قبروں پر تشریف لے جاتے، پھر کہتے سلامتی ہو تم پر بعوض اس کے جو تم نے صبر کیا۔ پس اچھا ہوا آخر ٹھکانا، اور خلفاء کرام بھی اسی طرح کرتے تھے۔"

قارئین! اگر سال کے بعد مقررہ تاریخ پر قبورِ صلحاء پر جانا ناجائز ہوتا تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کبھی بھی باقاعدگی سے ہر سال خاص تاریخ پر قبورِ شہداء پر تشریف نہ لے جاتے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم مقررہ تاریخ پر قبورِ شہداء پر جاتے تھے۔ اگر آج ہم مقررہ تاریخ پر کسی ولی اللہ کے مزار پر جا کر ایصالِ ثواب کریں، تو ناجائز کیوں کہلاتا ہے؟

عُرس کے متعلق مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ

فتاویٰ عزیزی جلد اوّل ص ۳۸ پر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"رفتن بر قبور بعد سالے یک روز معین کردہ سہ صورت است۔ اول: آں کہ یک روز معین نمودہ یک شخص یا دو شخص بغیر ہیئتِ اجتماعیہ مردمانِ کثیر بر قبور محض بنا بر زیارت واستغفار بروند ایں قدر از روئے روایات ثابت است ودر تفسیر درِّ منثور نقل کردہ کہ ہر سال آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم بر مقابر می رفتند ودُعا برائے مغفرت اہلِ قبور می نمودند۔ ایں قدر ثابت ومستحب است۔ دوم: آنکہ بہیئتِ اجتماعیہ

مردمانِ کثیر جمع شدند و ختمِ کلام اللہ کنند و فاتحہ بر شیرینی یا طعام نمودہ تقسیم در میانِ حاضران نمایند۔ ایں قسم معمول در زمانہ پیغمبر خدا و خلفائے راشدین نبود۔ اگر کسے بایں طور بکند باک نیست۔ زیرا کہ دریں قسم قبح نیست، بلکہ فائدہ احیا و اموات را حاصل می شود۔ سوم، طور جمع شدن بر قبور ایں است کہ مردماں یک روز معین نمودہ و لباس ہائے و نفیس پوشیدہ مثلِ روزِ عید شادماں شدہ بر قبرہا جمع شدند۔ رقص و مزامیر و دیگر بدعاتِ ممنوعہ مثلِ سجود برائے قبور و طواف کردن قبور می نمایند، ایں قسم حرام و ممنوع است، بلکہ بعضے بحدِ کفر می رسند و ہمیں است محمل، محمل ایں دو حدیث ولا تجعلوا قبری عیدًا چنانچہ در مشکوٰۃ شریف موجود است اللّٰھم لا تجعل قبری وثنا یعبد۔

ترجمہ "سال میں کوئی ایک دن مقرر کر لینا اس غرض سے کہ خاص اُس دن بزرگوں کی قبر کی زیارت کی جائے۔ اُس کی تین صورتیں ہیں: اوّل یہ کہ کوئی ایک دن مقرر کریں اور اُس دن صرف ایک ایک شخص یا دو دو شخص کر کے جا کر قبر کی زیارت کر آئیں، مگر زیادہ آدمی ایک ہی دفعہ ہیئتِ اجتماعیہ نہ جائیں، تو اُس قدر روایات سے ثابت ہے چنانچہ تفسیر دُرِ منثور میں منقول ہے کہ ہر شروع سال میں رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم مقابر میں تشریف لے جاتے اور دُعا اہلِ قبور کی مغفرت کے واسطے کرتے تھے۔ اس قدر ثابت اور مستحب ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ مردمانِ کثیر جمع ہوں اور ختمِ قرآن شریف کریں اور شیرینی یا کھانا فاتحہ کریں اور اس کو حاضرین میں تقسیم کریں۔ ایسا معمول زمانۂ پیغمبرِ خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و خلفائے راشدین میں نہ تھا لیکن ایسا کرنے میں مضائقہ نہیں، اس واسطے کہ اس میں کوئی بُرائی نہیں، بلکہ اس میں احیاء و اموات کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ لوگ کوئی ایک دن مقرر کر لیتے ہیں اور اس میں لباس ہائے فاخرہ اور نفیس پہن کر عید کی مانند بخوشی و خرمی قبروں کے پاس جمع ہوتے ہیں اور رقص و مزامیر اور دیگر بدعاتِ ممنوعہ کرتے ہیں اور قبروں کا طواف کرتے ہیں تو یہ طریقہ حرام و ممنوع

ہے، بلکہ بعض لوگ کفر تک پہنچ جاتے ہیں اور یہی مراد ہے ان دو حدیثوں سے کہ لا تجعلو قبری عیدًا (یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری قبر کو عید نہ بنا لینا) اور اللّٰھم لا تجعل قبری وثنا یعبد (یعنی رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دُعا کی کہ اے میرے پروردگار نہ بنا دینا میری قبر کو بُت کہ اُس کی پرستش کی جائے۔")

قارئین کرام! اس فتوی سے کئی باتیں ثابت ہوئیں، اوّل مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے تعینِ عرس کی اصلیت حدیث سے پہنچائی کہ تفسیر دُرِ منثور اور دوسری مُستند تفسیروں میں یہ حدیث پاک موجود ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سال بسال شہداء کی قبور پر ہر سال کے سرے پر تشریف لاتے تھے اور اسی طرح آپ کے بعد آپ کے خلفاء اربعہ کرتے رہے۔

دوم، کہ اگر کسی ولی اللہ کے مزارِ اقدس پر کافی لوگ مقررہ تاریخ پر جمع ہو کر ختم قرآن پاک کر کے یا شیرینی کھانا وغیرہ پر فاتحہ کر کے غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیں تو بالکل جائز ہے۔ اس میں ہرگز کوئی خرابی نہیں، بلکہ فرماتے ہیں کہ اس طرح کرنے میں زندوں اور مُردوں دونوں کا فائدہ ہے۔

سوم، قبروں پر رقص، مزامیر یا قبروں کا طواف کرنا یہ باتیں ناجائز ہیں۔ بحمد اللہ تعالیٰ ہم اہل سنت و جماعت بھی قبروں پر میلے لگانے، رقص کرنے یا قبروں کے طواف کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں اور حتی الوسع جہلاء کو اس سے روکتے ہیں۔

عرس کے لیے دِن مقرر کرنا

مولانا شاہ عبد العزیز صاحب محدثِ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بجواب مولوی عبد الحکیم پنجابی رسالہ ذبیحہ میں ارقام فرماتے ہیں،

قولہٗ عرس بزرگان خود را الخ . . . . . ایں طعن مبنی است بر جہل باحوال

مطعون علیہ زیرا کہ غیر از فرائض شرعیہ مقررہ ہیچ کس فرض نمی داند۔ آرے زیارت و تبرک بقبور صالحین و امداد ایشاں بامدادِ ثواب و تلاوت قرآن و دُعائے خیر و تقسیم طعام و شیرینی امر مستحسن و خوب است باجماعِ علما۔ تعیین روزِ عرس برائے آں ست کہ آں روز مذکر انتقالِ ایشاں می باشد۔ از دار العمل بدار الثواب و الّا ہر روز کہ ایں عمل واقع شود موجب فلاں و نجات است و خلف را لازم است کہ سلف خود را بایں نوع بر و احسان نماید۔

ترجمہ: "سائل کا قول کہ بزرگوں کے عرس کے لیے ۔ ۔ ۔ الخ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ طعن اُن لوگوں کے حال سے عدم واقفیت پر مبنی ہے جن پر طعن کیا گیا ہے، کیونکہ فرائضِ شرعیہ مقررہ کے سوا اور کسی چیز کو کوئی فرض نہیں سمجھتا۔ ہاں زیارت اور حصولِ برکت قبورِ صالحین سے اور ایصالِ ثواب سے اُن کی امداد کرنا اور تلاوتِ قرآن اور دعاءِ خیر تقسیمِ طعام و شیرینی امرِ مستحسن ہے اور خوب ہے۔ علماء کے اجماع سے تعینِ روزِ عُرس کا اس لیے ہے کہ وہ دن اُن کے انتقال کو یاد دلاتا ہے، جبکہ وہ دار العمل سے دار الثواب کو گئے، ورنہ اگر ہر روز یہ عمل واقع ہو تو موجبِ فلاح و نجات ہے اور خلف کو لازم ہے کہ اپنے سلف کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا کریں۔"

قارئین! جس طرح آجکل بعض لوگ بغضِ باطنی کو ظاہر کرنے اور مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کے لیے کہتے ہیں کہ اہل سنت وجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ عُرس کے دن کے سوا کسی ولی اللہ کو ایصالِ ثواب ہوتا ہی نہیں یا عُرس کو فرض جانتے ہیں۔ اسی طرح شاہ صاحب کے زمانے میں بھی چند ایسے جہلاء موجود تھے۔ اس لیے آپ فرماتے ہیں کہ اُن لوگوں کا یہ الزام ان کی جہالت کی دلیل ہے۔

عُرس اور عقیدۂ اہل سُنت

کسی جاہل سے جاہل سُنّی کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ عرس کے دن کے سوا عبادات کا

ثواب بزرگوں کو نہیں پہنچ سکتا، بلکہ یہ تو عام مشاہدہ کی بات ہے کہ سارا سال لوگ بزرگانِ دین کے مزارات پر حاضر ہوتے رہتے ہیں اور کلام پاک پڑھ کر یا غرباء میں کھانا تقسیم کرکے اس کا ثواب ان بزرگوں کی رُوح کو پہنچاتے رہتے ہیں اور کوئی جاہل بھی عُرس یا گیارہویں کو فرض یا واجب قرار نہیں دیتا، بلکہ اُن کو صرف مستحسن کام سمجھتا ہے۔

عرس کے دن برکت

جس دن مقبولانِ بارگاہِ الٰہی کے اپنے محبوبِ حقیقی کے ساتھ وصال کا دن ہو، اُس دن اللہ رب العزت کی طرف سے سلامتی و برکت کے نزول کا دن ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یحییٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

وَسَلامٌ علیہ یومَ وُلِدَ ویومَ یموتُ وَیومَ یبعث حَیًّا۔

ترجمہ: اور سلامتی و برکت ہے اوپر (یحییٰ علیہ السلام کے) جس دن پیدا ہوا جس دن فوت ہوا اور جس دن اٹھایا جائے گا۔"

دوسری جگہ پر عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد موجود ہے:

وَالسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا۔

ترجمہ: "اور سلامتی و برکت ہے میرے اوپر جس دن میں پیدا کیا گیا، جس دن مروں گا اور جس دن اُٹھایا جاؤں گا۔"

قارئین کرام! یہ بات تو قرآن حکیم سے ثابت ہو گئی کہ مقبولانِ خدا کے وصالِ مبارک کے دن اللہ تعالیٰ جل شانہ کی طرف سے رحمت اور سلامتی و برکت کا نزول ہوتا ہے۔

دیوبندیوں کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی کا عرس کا دن مقرر کرنے کے متعلق قول:

"پس عرس میں جو تاریخ متعین ہوتی ہے اگر اس تعیین کو قربت نہ سمجھیں۔ بلکہ اور کسی مصلحت سے تعیین ہو، مثلاً سہولت اجتماع تاکہ تداعی کی صعوبت یا بعض اوقات اُس کی کراہت کے شبہ سے مامون رہیں اور خود اجتماع اس مصلحت سے ہو کہ ایک سلسلہ کے احباب باہم ملاقات کر کے حب اللہ کو ترقی دیں اور اپنے بزرگوں کو آسانی اور کثیر مقدار میں جو کہ اجتماع سے حاصل ہے، ثواب پہنچانا ہے، بے تکلف میسر ہو جائے۔ نیز اس اجتماع میں طالب علموں کے لیے اپنے شیخ کا انتخاب آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تو ظاہری مصالح ہیں جو مشاہد ہیں یا کوئی باطنی مصلحت بھی داعی ہو۔ . . . . . . بہر حال اگر ایسے مصالح سے تعیین ہو تو فی نفسہ جائز ہے۔" (بوادر النوادر ص ۴۵۷)

عرس کے متعلق مرشدِ علماء دیوبند حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان

جو کہ اکابرین علماء دیوبند میں سے اکثر کے پیر و مرشد ہیں اور تمام علماء دیوبند انہیں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اپنی مشہور کتاب فیصلہ ہفت مسئلہ ص ۸۵ پر تحریر فرماتے ہیں:

"لفظ عرس اس حدیث سے لیا گیا ہے: نَم کنومۃ العروس یعنی مرنے کے بعد صالح بندے سے کہا جاتا ہے "سو جا دلہن کی نیند"۔ اللہ کے مقبول بندوں کے حق میں موت محبوبِ حقیقی سے ملنے کا نام ہے اور اسی وجہ سے اُن کی موت وصال کہی جاتی ہے یعنی ملاپ۔ اب جو محبوبِ حقیقی سے جا ملے، اس سے بڑھ کر کیا شادی ہو سکتی ہے۔ عرس کی رسم جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مرنے والوں کی روحوں کو ایصالِ ثواب کرنا ایک پسندیدہ فعل ہے۔

اس سلسلہ میں جن بزرگوں سے ہم نے فیوض و برکات حاصل کیے ہیں، ان کا ہمارے اوپر سب سے زیادہ حق ہے۔ پھر اپنے پیر بھائیوں سے ملنا محبت کو بڑھاتا ہے اور باعثِ برکت بھی ہے، اس کے ساتھ طالبوں کا یہ فائدہ ہے کہ پیر کی تلاش میں دقت نہیں ہوتی، کیونکہ بہت سے مشائخ رونق افروز ہوتے ہیں، ان میں جن سے عقیدت ہو ان کے مرید ہو سکتے ہیں۔ اس طرح سلسلہ کے سب لوگ ایک تاریخ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملاقات ہو جاتی ہے اور صاحبِ مزار کی رُوح کو قرآن کریم کی تلاوت اور کھانا تقسیم کرنے کا ثواب بھی پہنچایا جاتا ہے۔ اس مصلحت سے ایک خاص تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔ اب یہ تاریخ وفات کا دن کیوں ہے؟ اس میں کچھ راز پوشیدہ ہیں، جن کے اظہار کی ضرورت نہیں چونکہ بعض سلسلوں میں سماع کا رواج ہے، اس لیے حال کو تازہ کرنے اور ذوق و شوق کو بڑھانے کے لیے کچھ سماع بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عُرس کی اصلیت یہی ہے، اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا، بلکہ بعض علماء نے تو احادیث سے اس کا جواز نکالا ہے۔ ایک شبہ اس حدیث سے پیدا ہوتا ہے: لَا تتخذوا قبری عیدًا یعنی میری قبر کو میلہ مت بنانا۔ اس حدیث کے صحیح معنی یہ ہیں کہ قبر پر میلہ لگانا، خوشیاں کرنا، زینت و آرائش اور دھوم دھام کا اہتمام کرنا، یہ سب منع ہے، کیونکہ زیارتِ قبور، عبرت اور آخرت کو یاد دلانے کے لیے ہے نہ کہ غفلت اور زینت کے لیے۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ قبر پر جمع ہونا منع ہے، ورنہ قافلوں کا روضہ اقدس کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ بھی جانا منع ہوتا اور ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے حقیقت یہ ہے کہ زیارتِ قبور اکیلے یا جماعت کے ساتھ دونوں طرح جائز ہے اور ایصالِ ثواب بذریعہ تلاوتِ قرآن اور تقسیمِ طعام بھی جائز اور مصلحت سے خاص تاریخ کو مقرر کرنا بھی جائز اور یہ سب مل کر بھی جائز رہا۔"

مولوی اسمٰعیل دہلوی کا قول

ہندوستان میں وہابیت کے بانی مولوی اسمٰعیل دہلوی "صراطِ مستقیم" ص ۱۰۳ پر لکھتے ہیں:

"پس امورِ مروجہ یعنی اموات کے فاتحوں، عرسوں اور نذر و نیاز سے اس امر کی خوبی میں کچھ شک و شبہ نہیں۔"

مولانا شاہ رفیع الدین کا فتویٰ

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلوی اپنے فتاویٰ میں عرس کے متعلق لکھتے ہیں:

"زمانہ اگرچہ سیال غیر قار کہ جاری رواں دواں ایسا ہے کہ اس کو قرار نہیں، لیکن جو کچھ اس سے زمانہ کے لیے اوقاتِ رات اور دن مہینے اور برس سے اندازہ کیا جاتا ہے، ان کے لیے شرع اور عرف میں دورہ مقرر ہے۔ جب ایک دورہ تمام ہو جاتا ہے، پھر نئے سرے سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی حساب سے رمضان کو روزے کے مہینے سے اور ذی الحجہ کو حج کے مہینے سے اور اسی طرح دوسرے مہینوں کو دورہ میں اسی کی نظیر پر اختیار کر کے حکم دے دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ یہود نے جنابِ نبوت میں عرض کیا کہ خدائے برتر نے موسیٰ علیہ السلام کی مدد فرعون کے غرق کرنے میں اسی روز کی ہے، اُس کے شکرانہ کے لیے ہم روزہ رکھتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں زیادہ حقدار ہوں اس کسی سے کہ اس نے میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام کے ذمہ کو پورا کیا۔ پس آپ نے عاشورہ کے دن روزہ رکھا اور لوگوں کو اس دن روزہ کی نسبت حکم دیا اور ایسے ہی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی دوشنبہ کے روزہ کی اور فرمایا میں اسی دن میں پیدا ہوا اور مجھ پر اسی دن وحی اُتری اور اسی دن میں نے ہجرت کی اور اسی دن مروں گا۔ اسی سبب سے تاریخ اور ماہ کا یاد کرنا لوگوں کی رسم میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ حقیقت میں فائدہ اس روز کے یاد رکھنے کا معلوم نہیں کیا، کیونکہ صدقہ اور دُعا کرنے کا وقت ہمیشہ ہے لیکن جو لوگ اس جہان سے اس رسم کی مخالفت کرتے گزر گئے ہیں، ان کو نیکی کا انتظار اپنے والدین یا قرابت والوں کی طرف سے رہتا ہے، اُن کے انتظار کا اٹھا دینا بڑے فائدوں میں شمار کیا گیا ہے اور معاملاتِ مکاشفہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ ایسے دنوں میں کہ بزرگوں کے سالانہ عرس کے دن ہوں، دوستانِ خدا کی رُوحیں برزخ میں جمع ہوتی ہیں۔ پس عوام و صلحاء کا جمع ہو کر اس دن دُعا اور ختمِ قرآن سے مدد کرنا اور کھانا کھلا کر ثواب پہنچانا ایک بدعت مباح ہے۔ کوئی وجہ قباحت کی اس میں نہیں، نہ یہ کوئی صورت قبیح ہے، بلکہ اس کو بدعتِ مباح کہنا چاہیے کہ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا فتویٰ

شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ اپنی کتاب "ماثبت السنۃ" میں فرماتے ہیں:

انما ھو من المستحسنات المتاخرین (عرس متاخرین کے نزدیک اچھے کاموں میں سے ہے) شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وہابیوں، دیوبندیوں کے نزدیک بھی مسلم شخصیت ہیں اور وہ اپنی کتابوں میں اُن کے حوالے بھی دیتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا فتویٰ

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جن کو دیوبندی وہابی حضرات بھی اپنے اکابرین میں سے سمجھتے ہیں۔

"ازیں جا است حفظ اعراس مشائخ و مواظبت زیارتِ قبورِ ایشاں والتزام فاتحہ خواندن و صدقہ دادن برائے میت و اعتنائے تعظیم کردن بتعظیم۔"

ترجمہ: "اسی پر مبنی ہے مشائخ کے ایامِ عرس کی حفاظت کرنا اور اُن کی زیارتِ قبور کے پابند رہنا اور میت کے لیے فاتحہ پڑھنے، صدقہ دینے کو لازم سمجھنا اور تعظیم کا پورا پورا خیال رکھنا۔"

قارئین کرام! جہاں تک عرس کے جواز کا تعلق ہے محققین کی ایک جماعت اصل عُرس کے جواز و استحسان کی طرف گئی ہے اور اس کے قائل و فاعل بڑے بڑے علماء و مشائخ اور محدثین و محققین ہیں۔ باقی رہ گئے عرس کو ناجائز اور بدعت کہنے والے تو ہم اُن کے علم و عقل کا قصور ہی کہیں گے کیونکہ اتنے بڑے بڑے محدثین محققین کے مقابلے میں ان کی حیثیت تو ذرہ ناچیز جتنی بھی نہیں۔

نجات ملے یا کسی طرح کا کوئی بڑا اعزاز حاصل ہو تو اُس کی قوم کے لوگ اُس کے احباب اور عزیز و اقارب اُس کے معتقدین کو بڑی خوشی ہوتی ہے، وہ مبارکباد دیتے ہیں، اُس کی دعوتیں کرتے ہیں اور وہ دن بطورِ یادگار کے خیال کیا جاتا ہے اور جب وہ زمانہ آتا ہے تو وہ باتیں یاد پڑتی ہیں، چنانچہ یہود بوجہ خوشی نجات حضرت موسیٰ علیہ السلام اور غرق فرعون عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے۔ جب رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو معلوم ہوا تو فرمایا: نحن احق بموسیٰ (یعنی ہم زیادہ حق دار ہیں ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے) اس لیے آپ نے خود بھی روزہ رکھنا شروع کیا اور اپنے اصحاب کو بھی حکم دیا (بخاری ج ا صفحہ ۲۶۸)

اسی طرح مسلمانوں کے روحانی مقتدا اور پیشوا اور بزرگانِ دین کی وفات جو ظاہری اعتبار سے ایک دردناک اور سخت صدمہ دینے والی مصیبت ہے لیکن بایں اعتبار کہ انہیں آج محبوبِ حقیقی کا وصل نصیب ہوا۔ مدت کا غم ہجر دور ہوا اور لقائے محبوب کا شرف اور اعزاز حاصل ہوا۔ اُن بزرگوں کے متوسلین و محبین کو عجب جوش اور مسرت ہوتی ہے اور جب وہ زمانہ اور دن آتا ہے تو انہیں وہ بزرگ یاد آجاتے ہیں اور شرعی حدِ جواز کے اندر خوشیاں مناتے ہیں۔ تلاوتِ قرآن اور اطعام طعام وغیرہ کا ثواب، اُن کی رُوحِ پاک کو ہدیہ کرتے ہیں جو اُن کے لیے بمنزلہ مبارکباد و دعوت کے ہے۔

اعتراض: عُرس پر کثرتِ اجتماع کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: اجتماع مسلمانوں کے بہت زیادہ فوائد ہیں۔ ہر شخص تلاوتِ قرآن اور فاتحہ ایصالِ ثواب کرے گا۔ جتنا اجتماع زیادہ ہوگا اتنا ہی فاتحہ اور تلاوتِ قرآن مجید کثرت سے ہوگی اور کثرت سے اُس بزرگ کی رُوح کو ثواب پہنچے گا جو باعثِ فیضان ہے۔ اخوانِ طریقت اور پیر بھائیوں سے ملاقات ہوگی جو باعثِ راحت ہے اور حُبّ اللہ کو ترقی ہوگی۔ مشائخ طریقت اور اہل اللہ سے شرفِ نیاز حاصل ہوتا ہے اور طالبین کو فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں اور بزرگانِ دین کے یومِ وصال قرآن کی رُو سے برکت والے ہوتے ہیں، تو

اس دن کے فیوض و برکات سے آنے والے مستفیض ہوتے ہیں، اس کے علاوہ عرس کے موقع پر جید علمار کرام کی تقاریر سُن کر عوام الناس کے عقائد و اعمال کی اصلاح ہوتی ہے اور مشائخ عظام سے رُوحانیت کا درس لیتے ہیں اور تلاش مرشد میں آسانی رہتی ہے۔

گیارھویں شریف پر منکرین کا افترا اور اُس کا جواب

گیارھویں شریف کا عمل مدت سے قدمار صالحین، علمار راسخین اور مشائخ کاملین میں مقبول و معمول رہا ہے — گیارھویں شریف کی اصل یہ تھی کہ حضرت غوث صمدانی رحمۃ اللہ علیہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے چالیسویں کا ختم شریف ربیع الثانی کی گیارہ کو کیا کرتے تھے۔ وہ نیاز اتنی مقبول و مرغوب ہوئی کہ ازاں بعد ہر ماہ کی گیارہ تاریخ کو ہی نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ختم شریف اور نیاز دلانے لگے — آخر رفتہ رفتہ یہی نیاز حضور غوث پاک کی گیارھویں شریف مشہور ہوگئی۔ آجکل لوگ آپ کا عرس مبارک گیارہ تاریخ کو کرتے ہیں حالانکہ آپ کی تاریخ وصال سترہ ربیع الثانی ہے۔

معلوم ہوا کہ گیارھویں شریف اصل میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا عرس مبارک ہے جو حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہوگیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب "ماثبت بالسنۃ" ص۶۸ پر تحریر فرماتے ہیں:

قد اشتھر فی دیارنا ھذا الیوم الحادی عشر وھو المتعارف عند مشائخنا من اھل الھند من اولادہ

ترجمہ: "ہمارے ملک میں گیارھویں شریف کا دن مشہور ہے اور یہی ہمارے مشائخ جو پیران پیر کی اولاد سے ہیں، کے نزدیک متعارف ہے۔"

ایک اور جگہ یہی شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

ھوالذی ادرکنا علیہ سیدنا الشیخ الامام العارف الکامل الشیخ عبدالوھاب القادری المتقی فانہ قدس سرہ کان یحافظ فی یوم عرس ھذا التاریخ۔

ترجمہ: "یعنی وہ تاریخ ہے کہ جس پر ہم نے شیخ کامل عارف عبدالوہاب قادری کو پایا۔ یہ حضرت ہمیشہ اسی تاریخ کو حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عُرس مبارک کیا کرتے تھے"۔

قارئین کرام! گیارہویں شریف بھی عرس کی طرح ایصالِ ثواب کا ایک طریقہ ہے اور منکرین اس کو ناجائز صرف اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں تاریخ متعین کر دی گئی ہے۔ کسی نیک عمل کے لیے محض سہولتِ دوام یا کسی اور سہولت کے پیشِ نظر وقت مقرر کرنا صحابۂ کرام سے بھی ثابت ہے اور علماء دیوبند کے اکابرین بھی اس تعیین کے قائل ہیں، جیسے کہ اس کی تحقیق گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ گیارہویں شریف جو لوگ مناتے ہیں اُن میں سے کسی جاہل سے جاہل کا بھی یہ نظریہ نہیں ہوتا کہ اس دن کے سوا ثواب نہیں پہنچتا یا اس دن ایصالِ ثواب کرنا فرض یا واجب ہے۔ بلکہ ہر آدمی اسے ایک نیکی کا کام سمجھ کر کرتا ہے اور اسے ضروری ہرگز گمان نہیں کرتا اور یہ محض منکرین کا الزام ہے کہ اہلِ سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ "اس دن اگر غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نیاز نہ دی جائے تو مصیبت ٹوٹ پڑتی ہے" اہلِ سنت خواص تو اپنی جگہ رہے، عوام کو بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ کبھی کبھی ۱۲ اور کبھی ۱۱ کو ایصالِ ثواب کرتے ہیں اور کبھی کبھی نہیں کرتے۔ تو یہ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ نہ تو وہ گیارھویں کو فرض یا واجب سمجھتے ہیں اور نہ اس گیارہ تاریخ کے دن ایصالِ ثواب کو ضروری سمجھتے ہیں۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے لیے ایصال ثواب

۲۲ رجب کا ختم شریف سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی یاد میں ختم شریف اور ایصالِ ثواب بعض جگہوں پر اہلِ سنت وجماعت میں معمول و معروف ہے اور گیارہویں شریف کی طرح یہ

ختم شریف بھی عقیدت و محبت سے دلایا جاتا ہے مخالفین اہل سنت و منکرین گیارہویں چونکہ محبوبانِ خدا و بزرگانِ دین کی یاد منانے اور ختم شریف دلانے کے شروع ہی سے خلاف ہیں اسی لیے وہ میلاد و عرس و گیارہویں کی طرح ۲۲ رجب کے خلاف بلاوجہ واویلا کرتے رہتے ہیں۔

اعتراض: ۲۲ رجب نہ تو سیدنا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا یوم ولادت ہے اور نہ ہی یوم وفات۔ بلکہ ۲۲ رجب سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یوم وفات ہے، اس لیے مخالفینِ صحابہ و امیر معاویہ نے اس رسم کے ذریعے آپ کی وفات کی خوشی منائی ہے۔

جواب: اصولی طور پر بزرگانِ دین کی یاد منانا اور ختم دلانا باعثِ خیر و برکت ہے، اور ایصالِ ثواب شرعاً ثابت ہے اور یہ ختم شریف یوم ولادت، یوم وصال کی طرح کسی اور دن دلانا بھی جائز ہے، لہٰذا اگر ۲۲ رجب امام صاحب کا یوم ولادت و وصال نہ ہو تو بھی اُن کی یاد منانے اور ختم شریف پڑھانے میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔ باقی رہا ۲۲ رجب کو امیر معاویہ کا یوم وصال ہونا تو اگرچہ یہ تاریخ متفقہ نہیں، پھر بھی اہل سنت کے نزدیک امام صاحب کا ختم شریف دلانے سے امیر معاویہؓ کی مخالفت کا کوئی تعلق نہیں۔ ایک تو ختم شریف "جشنِ مسرت" کے طور پر ویسے ہی معمول نہیں۔ اگر مخالفینِ صحابہ کے ہاں ایسا ہے تو بھی اُن کی طرف سے اس دن امیر معاویہ کی مخالفت کا کوئی مظاہرہ دیکھنے میں نہیں آیا اور اگر خدانخواستہ وہ ایسا کریں بھی تو اس کا وبال انہی کے سر ہے، وہ اور کیا کچھ نہیں کرتے۔ اہل سنت کے ہاں تو ۲۲ رجب کے ختم شریف کے موقع پر مخالفت کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی خیال نہیں کرتا۔

طریق اصلاح: بہرحال اگر مانعین کو واقعی اس دن مخالفت کا کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو اس کا یہ طریقہ نہیں کہ ایک "اچھے کام" سے روکنے والے بن کر ختم شریف کو بند کرا دیا جائے، بلکہ اس کی اصلاح کا یہ طریقہ ہے کہ مانعین اگر واقعی امیر معاویہ سے بہت عقیدت رکھتے ہیں تو وہ ۲۲ رجب کو ختم شریف بند کرانے کی ناکام کوشش کرنے کی بجائے اس بات کی تبلیغ کریں کہ چونکہ ۲۲ رجب حضرت امیر معاویہ کا یوم وصال بھی ہے، اس لیے ختم شریف میں امام جعفر صادق کے ساتھ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بھی شامل کیا جائے۔

منکرین کا ایک اور مغالطہ اور اُس کا جواب

بعض کم فہم عوام کو مغالطہ میں ڈالنے کے لیے اکثر کہا کرتے ہیں کہ فلاں کام جو اہل سنت کرتے ہیں، اس کا کرنا حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں، اس لیے یہ درست نہیں۔ بیچارے عوام اس مغالطے میں پھنس جاتے ہیں اور فوراً کہہ دیتے ہیں جب یہ کام حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں تو منع ہے، حالانکہ نہ تو جواز کے لیے ثبوتِ خاص کی ضرورت ہے، نہ عدم ثبوت دلیل ممانعت ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ عدم ثبوت دلیل عدم سنیت ہوگا نہ کہ دلیل عدم جواز۔

تفصیل یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ نے بعض عبادات کو بعض ہیئات وخصوصیات کے ساتھ مقید کر دیا ہے۔ وہ اسی طرح ادا ہوں گی، ان میں تغیر وتبدل اور زیادت ونقص روا نہیں۔ اسی طرح بعض عبادات کو شریعت نے عام اور مطلق کر رکھا ہے۔ کسی ہیئت ووقت وحال وکیفیت وکمیت کے ساتھ مقید نہیں کیا۔ انہیں جس طرح بھی ادا کریں گے بشرطیکہ اس شکلِ خاص کی ممانعت شرع میں نہ ہو تو حکم کا ماننا پورا ہو جائے گا۔ ایسی جگہ پر شرع کا اطلاق بتا رہا ہے کہ اُس نے اجمالاً سب صورتوں کی اجازت دی ہے تو معلوم ہوا کہ ثبوت کے لیے تصریح جزئیات وہیئاتِ مخصوصہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عمومات واطلاقات شرعیہ میں داخل ہونے کے سبب بھی اس امر کو ثابت فی الشرع کہیں گے اور اس کو مفہوم بدعت سے خارج سمجھ کر اس کے جواز کا اعتراف ضروری ہوگا۔

غیر مقلدین کے امام مولوی وحید الزماں کا قول

نزل الابرار جلد دوم صفحہ ۴ پر مولوی وحید الزماں "احداث فی الدین" کی تشریح یوں کرتے ہیں:

اِلّا اذا کان لہا اصلٌ من الشرع او دخلتْ فی عمومات النصوص۔

ترجمہ: یعنی اگر اس کام کا شریعت میں کچھ اصل ہو یا وہ نصوص کے عمومات میں میں داخل ہو تو وہ بدعتِ مذمومہ محرمہ نہیں ہے بلکہ اس سے مستثنٰی ہے۔"

اور کسی امر کے متعلق یہ کہنا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ثبوت نہیں یعنی کرنا اور نہ کرنا دونوں امر ثابت نہیں تو اولاً اس کے متعلق صحیح حکم لگانا دشوار ہے کیونکہ کتب حدیث بے شمار ہیں کئی مطبوعہ ہیں کئی غیر مطبوعہ۔ تمام کتابوں کا ایک عالم کی نظر سے گزرنا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ ایک عالم کی نظر سے نہ گزری ہو، دوسرے کے علم میں موجود ہو۔ اس لیے ممکن ہے کہ ایک عالم اپنے علم اور نظر کے لحاظ سے کہہ دے کہ یہ امر رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں اور دوسرے کو اس کے ثبوت کا علم ہو۔ علاوہ اس کے حدیث کا بہت سا ذخیرہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ صرف امام بخاری کو چھ لاکھ احادیث یاد تھیں، لیکن آج کتبِ متداولہ میں ۷۰ ہزار سے زائد احادیث نہیں ملتی تو کسی امر کی نسبت تاوقتیکہ تمام احادیث کا مجموعہ پیشِ نظر نہ ہو، عدمِ ثبوت کا یقین نہیں ہو سکتا، البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ثبوت یا عدم ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ہم یہ نہیں سکتے کہ اس امر کے متعلق سرے سے نقل ہے ہی نہیں، بلکہ نقل ہمیں ملی نہیں۔

لیکن اگر عدمِ نقل ثابت ہو بھی جائے تو بھی اس سے عدمِ وقوع کو مستلزم نہیں ہوتا۔ یعنی اگر کوئی امر رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم یا صحابہ یا تابعین سے منقول نہ ہو تو اس سے عدمِ وقوع لازم نہیں آتا۔ ممکن ہے وقوع میں آیا ہو، لیکن منقول نہ ہوا ہو۔

عدمِ نقل، وجود کی نفی نہیں کرتی (علامہ ابن الہمام کا فرمان)

علامہ ابن الہمام فتح القدیر جلد اوّل صہ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

وبالجملة عدم النقل لاینفی الوجود۔

ترجمہ: عدم نقل سے وجود کی نفی نہیں ہوتی۔

عدمِ نقل، عدمِ جواز کی دلیل نہیں (علامہ ابن حجر کا فرمان)

علامہ ابن حجر فتح الباری شرح صحیح بخاری جزء ثالث صـ ۳۸۲ پر فرماتے ہیں،

عدم النقل لایدل علی عدم الوقوع ثم لو سلم لایلزم منہ عدم الجواز۔

ترجمہ: یعنی کسی امر کا منقول نہ ہونا عدم وقوع پر دلالت نہیں کرتا۔ اگر عدم وقوع مان بھی لیا جائے، تو اس سے عدم جواز لازم نہیں آتا۔"

یہی علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری کے صـ ۳۸۴ پر فرماتے ہیں:

لانّ السکوت عن الشیئ لایقتضی ترک فعلہ

ترجمہ: "کسی شئے سے سکوت، اُس کے ترک کا مقتضی نہیں۔"

ایسی صورت میں تاوقتیکہ اس کام کی ممانعت رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہ ہو، اس کا کرنا جائز ہی رہے گا، منع نہ ہوگا۔

قابلِ غور: رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ماہانہ مذہبی رسالہ نکالنا ثابت نہیں۔ اسی طرح سالانہ جلسہ کرنا، جلسوں کا طرح طرح کی زینت سے مزین کرنا، مدرسہ یا سرائے بنانا، مدرسین کا تنخواہ لینا، حدیث شریف کا کتابی صورت میں جمع کرنا۔ قرآن شریف میں اعراب لگانا، کسی حدیث کو شاذ کسی کو صحیح، کسی کو منقطع کسی کو ضعیف کہنا، قرآن میں سورتوں کے نام، آیتوں کا شمار، وقف وغیرہ علامات لکھنا، مسجدوں کے مینار وغیرہ بےشمار ایسے امور ہیں کہ جو رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت نہیں، لیکن چونکہ ان کی ممانعت نہیں، اس لیے یہ امور ناجائز نہیں۔

سرکارِ دو عالم ﷺ کے نہ کرنے سے کراہت لازم نہیں آتی

نمازِ عید کے پہلے یا بعد ثابت ہو چکا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے کوئی نماز نہیں پڑھی، لیکن اگر کوئی پڑھ لے تو اس حدیث کی رُو سے کوئی ممانعت نہیں۔ علامہ نووی شرح صحیح مسلم میں حدیث مالم یصل قبلھا ولا بعدھا کی شرح میں لکھتے ہیں: و حجۃ فی الحدیث لمن کرھھا لانہ لا یلزم من ترک الصلوٰۃ کراھتھا والاصل ان لا منع حتی یثبت۔ "یعنی عید سے پہلے اور پیچھے نماز پڑھنا مکروہ کہنے والوں کے لیے حدیث میں کوئی دلیل نہیں، کیونکہ ترک نماز سے اُس کی کراہت لازم نہیں آتی اور اصل یہ ہے کہ جب تک منع ثابت نہ ہو کوئی امر منع نہیں ہوتا۔"

کراہت کے لیے دلیل خاص چاہیے (علامہ شامی کا فتویٰ)

علامہ شامی ردالمحتار میں فرماتے ہیں: لَا بُدَّ لِلْکراھۃ من دلیل خاص
ترجمہ "یعنی کراہت کے لیے دلیلِ خاص کی ضرورت ہے"!

سرکارِ دو عالم کا نہ کرنا کراہت کی دلیل نہیں (شاہ ولی اللہ کا فرمان)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ عید سے قبل نوافل کے بارے میں اپنی کتاب مُصفّٰی شرح موطا" میں فرماتے ہیں:

"ماخذ دیگراں استصحاب مشروعیت اصل صلوٰۃ است دنیافتن دلیلے کہ دلالت کند بر منع زیراں کہ نہ کردن آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم دریں حالت دلالت بر کراہت نمی نماند، ترک فعلِ خیر نزد حضور دواعی آں دلیل کراہت نمی تواند شد"

البتہ ہمارے علماء نے ایک اور حدیث لکھی ہے اور فرمایا رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے لاصلوٰۃ فی العیدین قبل الامام (کہ امام سے پہلے عیدین میں کوئی نماز نہیں۔ پس جو لوگ کراہت نماز قبل عید کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہ حدیث ہے جس میں صریح ممانعت ہے، نہ حدیث ترک صلوٰۃ

سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ترکِ فعل کا دلیل کراہت بننا

ترکِ فعل دلیلِ کراہت تب بنے گا، جب سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے ارادتاً چھوڑا ہو۔ جب منکرین سے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا "نہ کرنا" ہی ثابت نہیں ہو سکتا تو ارادتاً چھوڑنا کب ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے ایک فعل واقع نہیں ہوا۔ اب جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس سے بالقصد اجتناب فرمایا، ہم اس فعل کے ترک میں اتباع کیسے کر سکتے ہیں۔ اگر ہم بالقصد اس فعل کو ترک کریں گے تو ہمارا اتباع اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے بالقصد اس فعل کا چھوڑنا ثابت ہو۔ اگر رسولِ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے بالقصد اس فعل کا چھوڑنا ثابت نہ ہو اور ہم نے قصداً چھوڑا تو ہم نے وہ کام کیا جو ان سے اصلاً ثابت نہ تھا۔ تو معلوم ہوا کہ جس کام کا رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے قصداً چھوڑنا ثابت نہیں۔ اگر ہم اسے چھوڑیں گے، تو اسی طرح سے سرکارِ دوعالم رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے طریقہ کی اتباع نہیں، بلکہ مخالفت لازم آئے گی۔

دیکھئے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جمع مصحف کے بارے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا: کیف تفعل شیئاً لم یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فقال عمر رضی اللہ عنہ

هو واللہ خیرٌ فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللہُ صدری (الحدیث)

ترجمہ: (حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا) ہم وہ کام کیوں کریں جس کو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا وہ خدا تعالیٰ کی قسم اچھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہی جواب لوٹاتے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ کھول دیا۔

قارئین! مقام غور ہے اور اس حدیث پاک میں صاف اور واضح فیصلہ ہے منکرین لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام ہم کیوں کریں جو رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت صدیق اکبر نے حضرت عمر فاروق کو زید بن ثابت نے حضرت ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو کہا۔ لیکن ہم منکرین کو وہی جواب دیتے ہیں جو حضرت عمر فاروق نے حضرت صدیق اکبر کو اور پھر صدیق اکبر نے زید بن ثابت (رضی اللہ عنہم) کو دیا کہ یہ کام اچھا ہے۔ گو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اسے نہیں کیا۔ اس جواب کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے صحابہ نے کافی ووافی سمجھ کر شبہ سے رجوع فرمالیا اور اس شبہ کے بے اصل ہونے پر صحابہ کرام نے اتفاق کیا۔ کیا یہ جواب جس پر صحابہ نے اتفاق کر لیا۔ اس شبہ کے دفع کرنے کے لیے کافی نہیں۔

فاتحہ خوانی کا ثبوت

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ میت کے لیے دُعائے مغفرت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ نیز اگر دعائے مغفرت جائز ہے تو پھر اس کا طریقہ کیا ہے؟ ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگی جائے یا بغیر ہاتھ اٹھائے۔ اور بعض لوگ ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنا بدعت کہتے ہیں۔ اس کی تحقیق فرما کر مشکور فرمائیں۔

الجواب ہوالموفق للصواب

مسلمان میت کے لیے دُعائے مغفرت امرِ مستحسن اور بلاشبہ جائز ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ خداوندی ہوتا ہے، والذین جآء و من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان۔

(ترجمہ) اور واسطے ان لوگوں کے آئے پیچھے ان کے، کہتے ہیں اے پروردگار ہمارے، بخش ہم کو، اور ہمارے بھائیوں کو، وہ جو آگے لائے ہم سے ایمان۔"

تو ثابت ہوا کہ فوت شدہ مسلمانوں کے لیے دُعائے مغفرت کرنا نیکی کا کام ہے اور مسلمانوں کی یہ علامت ہے۔ اور اس کا انکار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا میت کے گھر جا کر دُعا مانگنا (مشکوٰۃ شریف ۲۱۰)

فلبثو یومین او ثلاثۃ ثم جاء رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم فقال استغفروا لماعز بن مالک۔

(ترجمہ) جب صحابہ کرام دو یا تین دن (ماعز کے ہاں) ٹھہرے تو رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم وہاں تشریف لے گئے اور آپ نے فرمایا کہ ماعز بن مالک کے لیے دُعائے مغفرت کرو۔"

تو اس حدیثِ پاک سے میت کے گھر صحابہ کرام کا اجتماع بھی ثابت ہو گیا اور حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا دُعائے مغفرت کے لیے میت کے گھر جانا بھی ثابت ہو گیا اور میت کے لیے دُعائے مغفرت کرنا بھی ثابت ہو گیا۔

اب رہا یہ سوال کہ دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھانا جائز ہے یا ناجائز و بدعت ہے تو ہم مسلمان ہیں اور مکلف ہیں، لہٰذا احکامِ شرعیہ کے پابند ہیں تو دعا کے متعلق علمائے سلفِ صالحین کی تحقیق پر ہمیں عمل کرنا ضروری ہے جو کہ انہوں نے قرآن و حدیث سے سمجھی ہے۔

دُعا میں ہاتھ اٹھانا آدابِ دُعا سے ہے (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۹٦)

عن عکرمہ عن ابن عباس قال المسئلة ان ترفع یدیک حذوا منکبیک۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ اشعۃ اللمعات میں یوں کیا ہے:

گفت ابن عباس کہ ادب دُعا و سوال این است کہ برداری بر دو دست تا برابر بر دو دوش۔

(ترجمہ) "یعنی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ دُعا کے آداب سے یہ ہے کہ دُعا مانگنے والا اپنے ہاتھوں کو دونوں مونڈھوں تک اٹھائے۔"

قارئین: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے یہ پتہ چلا کہ دُعا میں ہاتھ اٹھانا آداب و مستحبات دعا سے ہے، تو اب جو شخص میت کے لیے دعائے مغفرت

میں ہاتھ سے منع کرتا ہے تو گویا بوجۂ جہالت آداب دُعا سے بھی وہ شخص ناواقف ہے۔ اُٹھانے

دُعا کے متعلق سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا معمول مشکوٰۃ ص ۱۹۶

قال کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم

رفع یدیہ فی الدعاء حتیٰ یریٰ بیاض ابطیہ۔

(ترجمہ) حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ معمول تھا کہ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے، یہاں تک کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی جاتی۔"

دُعا کے متعلق حضور سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا معمول (تفسیر مظہری پ ۲۴ ص ۲۷۳۔ مشکوٰۃ شریف ص ۱۹۶)

وعن السائب بن یزید عن ابیہ ان النبی علیہ السلام کان اذا دعا فرفع یدیہ مسح وجھہ بیدیہ (رواہ البیہقی فی الدعوات الکبیر)

(ترجمہ) حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ تحقیق نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم جب وقت بھی دُعا مانگتے ہاتھ اٹھاتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے چہرۂ مبارک کو مس کرتے تھے۔"

مندرجہ بالا احادیثِ مبارکہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ معمول تھا کہ آپ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھے۔ تو حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مغفرت کے لیے بھی آپ نے دُعا مانگی، لہٰذا آپ نے ہاتھ ضرور اُٹھائے ہیں۔ اب منکرِ دُعا کے لیے نفی پر کوئی دلیل لانی ہوگی، ورنہ فقط "میں نہ مانوں" سے کام نہیں چلے گا۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا مُردوں کے لیے

ہاتھ اُٹھا کر دُعا فرمانا۔(مُسلم شریف جلد اوّل ص ۳۱۳)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا راوی ہیں:

ثم انطلقت على اثره حتى جاء البقيع فاطال القيام ثم رفع يديه ثلاث مرات۔

(ترجمہ) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم حجرہ سے باہر تشریف لے گئے اور میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چل گئی، حتیٰ کہ آپ جنت البقیع میں پہنچ گئے۔ آپ نے طویل قیام کیا اور آپ نے تین دفعہ ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی۔ حضرت عائشہؓ کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ خدا نے مجھے اپنی اُمّت کے مردوں کے لئے دعاءِ مغفرت کرنے کا حکم دیا تھا۔

ناظرین کرام! مُردوں کے لیے ہاتھ اٹھا کر دُعائے مغفرت کرنا سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے فعلِ مبارک اور صحاح ستہ کی مستند کتاب مسلم شریف سے ثابت ہو گیا۔

حضرت امام نووی شارح مسلم رحمۃ اللہ علیہ اسی جگہ فرماتے ہیں:

فيه استحباب اطالة الدعاء وتكريره ورفع يدين فيه

(ترجمہ) یعنی حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس فعل سے دُعا کا لمبا مانگنا اور مکرر مانگنا اور دُعا میں ہاتھوں کے اُٹھانے کا مستحب ہونا ثابت ہو گیا۔

اس حدیث مبارک سے یہ ثابت ہو گیا کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مُردوں کی دُعائے مغفرت کے لیے تین دفعہ ہاتھ اُٹھائے۔ تو ان بیچارے منکرین کا کیا حشر ہو گا جو حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے فعل مبارک کی مخالفت کرتے ہوئے ایک دفعہ ہاتھ اُٹھانے کو بھی بدعت و گمراہی کہتے ہیں، تو ان کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے کیونکہ وہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے فعلِ مبارک کو

بدعت کہہ رہے ہیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا میت کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا۔ (مُسلم شریف جلد ثانی صفحہ ۳۰۲)

صحابیٔ رسول حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور ابو عامر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ایک جنگ میں شریک ہوئے۔ ابو عامر جنگ میں شہید ہو گئے۔ تو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو حضرت عبید ابن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کی خبر دے کر ان کا پیغام دیا:

فدعا رسول اللہ بماء فتوضاء منه ثم رفع يديه ثم قال اللهم اغفر بعبيد ابي عامر حتى رايت بياض ابطيه۔

(ترجمہ) "حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے پانی منگوا کر وضو فرمایا اور اپنے ہاتھ اٹھا کر یوں دُعا کی: اے اللہ! اپنے بندے ابی عامر کی مغفرت فرما۔" راوی بیان کرتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہاتھ اس قدر اٹھائے کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی کی زیارت کی۔"

ناظرین کرام! اب بفضلہ تعالیٰ مستند احادیث مبارکہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ سرکارِ دو عالم رسولِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے نئے فوت شدہ مُردے کے لیے بطور فاتحہ خوانی ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت فرمائی۔ اب جو شخص یہ کہتا ہے کہ میت کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دُعائے مغفرت کرنا بدعت ہے، تو وہ فعلِ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو ناجائز کہہ کر خود کو دائرۂ اسلام سے خارج کر رہا ہے۔ اس حدیثِ پاک کے ہوتے ہوئے بھی کسی شخص کا یہ کہنا کہ میت کے لیے ہاتھ اُٹھا کر

دُعا کرنا حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے فعل سے ثابت نہیں محض دعویٰ باطل ہے اور اس کی کوئی بھی حقیقت نہیں، بلکہ ایسا کہنا حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس پر اتہام باندھنا ہے۔ مقامِ صد افسوس ہے کہ جو لوگ علومِ عالیہ کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہیں۔ وہ خلافِ حقیقت بات کہہ کر ذرہ بھر جھجک بھی محسوس نہ کرتے ہوئے جہنم کا ایندھن بن رہے ہیں۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ ظاہری سے لے کر آج تک امتِ مسلمہ میں سے سوادِ اعظم (کثیر جماعت) کا طریقہ یہ ہے کہ میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دُعائے مغفرت کرتے ہیں اور فقط چند آدمی ہیں جو کہ ہاتھ اٹھا کر دُعائے مغفرت کرنے کو "بدعت و ناجائز" کہتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان چند آدمیوں کے آباؤ اجداد بھی کل تک ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگتے رہے ہیں، تو مسلمانوں کی اکثریت کے مقابلہ میں اور دلائلِ قاہرہ کی موجودگی میں چند تخریب پسند عناصر کو سچا کیسے کہا جا سکتا ہے؟

دلائلِ شرعیہ چار ہیں:

(۱) قرآن پاک (۲) حدیث شریف (۳) اجماعِ امت (۴) قیاس

مُردہ کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعائے مغفرت کرنا سنت کے ساتھ ثابت ہے جیسا کہ مذکورہ بالا مستند احادیث سے واضح ہے اور اجماعِ امت کے ساتھ بھی ثابت ہے کہ چودہ سو سال سے اپنے آپ کو مُسلمان کہلانے والے اپنے فوت شدہ مسلمان بھائی کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دُعائے مغفرت مانگتے آئے ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ (میری امت گمراہی پر اکٹھی نہ ہوگی)

مزید ارشاد فرمایا

اتبعوا سواد الاعظم من شذ شذ فی النار

(ترجمہ: بڑی جماعت کی پیروی کرو جو بڑی جماعت سے کٹ گیا وہ جہنم میں گیا)

(بڑی جماعت سے مراد مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں سے بڑا گروہ ہے)

فاتحہ خوانی کے موقع پر جب ہزاروں یا سینکڑوں کے مجمع میں تقریباً سب لوگ ہاتھ اٹھا کر مُردے کے لیے دعائے مغفرت کر رہے ہوتے ہیں اور صرف دو یا تین آدمی دُعا نہیں مانگ رہے ہوتے، تو وہ اپنے تئیں تو بڑے دیندار بن رہے ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ مسلمانوں کی بڑی جماعت کے طریقے کی خلاف ورزی کر کے "من شذ شذ فی النار" کی وعید کا مصداق بن رہے ہوتے ہیں، اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص باہر سے آکر مسلمانوں کے اس اجتماعِ کثیر کو دیکھے گا کہ جس میں سوائے چند آدمیوں کے سبھی دُعائے مغفرت کر رہے ہوتے ہیں، تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ چند لوگ (دُعا نہ مانگنے والے) کوئی غیر مسلم ہیں، کیونکہ غیر مسلم اپنے مُردوں کے لیے دُعائے مغفرت نہیں کرتے اور عمر رسیدہ لوگ اس بات کے عینی شاہد ہیں کہ تقسیم ہند سے پہلے جب ہندو لوگ یہاں رہتے تھے اور جب کوئی مسلمان مرجاتا تو وہ اس کے گھر جا کر دُعائے مغفرت کرنے کی بجائے کہتے تھے "بھگوان کی مرضی"۔ آج یہی طریقہ بعض نام نہاد مسلمان اپنا رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہندو لوگ دُعائے مغفرت کرنے کی بجائے کہتے تھے "بھگوان کی مرضی"۔ اور یہ لوگ دعائے مغفرت کرنے کی بجائے کہتے ہیں کہ "اللہ کی مرضی"۔

مقامِ افسوس ہے کہ بعض نام نہاد مسلمان سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کا طریقہ اپنانے کی بجائے ہندوؤں کا طریقہ اپنا رہے ہیں اور ادھر حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیثِ پاک تو ہر ایک شخص نے سُنی ہوگی:

من تشبہ بقوم فھو منھم۔

(ترجمہ) "جو کسی قوم کی مشابہت کرتا ہے، پس وہ اسی قوم کے حکم میں ہو جاتا ہے"۔

پس جو شخص سرکارِ دو عالم شفیعِ معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے

طریقہ کے خلاف کرے، اُس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ
ویتبع غیر سبیل المؤمنین نولّہ ما تولّٰی ونصلہ
جھنم وساءت مصیرا ○ (قرآن حکیم)

(ترجمہ) اور جو کوئی برخلاف کرے رسول کے پیچھے اس کے کہ ظاہر ہوئی ہدایت اور پیروی کرے سوا راہ مسلمانوں کے متوجہ کریں گے ہم اس کو جدھر متوجہ ہوا ہے اور داخل کریں گے ہم اس کو دوزخ میں اور بری ہے جگہ پھر جانے کی:

کسی مجمع میں اگر چند آدمی جماعتِ کثیرہ کی مخالفت کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر دعا نہ مانگیں، تو وہ یقیناً یتبع غیر سبیل المومنین کا مصداق بن رہے ہیں، انہیں آخرت کا خوف کرتے ہوئے ایسے فعلِ شنیع سے توبہ کرنی چاہیے۔

دُعا نہ مانگنے والوں کا حشر قرآن کریم کی زبانی

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دُعا مانگنے سے تکبر کرتے ہیں، ان کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:

انّ الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین ○

(ترجمہ) بے شک وہ جو میری عبادت (دُعا) سے تکبر کرتے ہیں، عنقریب جہنم میں جائیں گے ذلیل و خوار ہو کر۔

قارئین کرام! مقامِ غور ہے کہ جو لوگ دُعا سے تکبر کرتے ہیں، ان کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ اور ایسے لوگ جو نہ خود دُعا مانگتے ہیں اور نہ دوسروں کو مانگنے دیتے ہیں، تو پھر ان کے لیے تو بطریقِ اولیٰ وعید جہنم ہو گی۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے عبادت و دُعا سے روکنے والوں کے متعلق غضب ناک ہو کر فرمایا،

اَرَأَیتَ الَّذِی یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی۔

(ترجمہ: کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو کہ بندے کو عبادت و دعا سے روکتا ہے:)

دُعا مانگنے والوں کا مذاق اڑانے والوں کے متعلق فرمانِ خداوندی

قال اخسئوا فیہا ولا تکلمون انہ کان فریق من عبادی یقولون ربنا اٰمنا فاغفرلنا وارحمنا و انت خیر الراحمین ہ فاتخذتموھم سخریا حتّٰی انسوکم ذکری وکنتم منھم تضحکون ہ

(ترجمہ: (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ فرمائے گا راندے ہوئے جہنم میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو بے شک میرے بندوں میں سے ایک جماعت دُعا مانگتی تھی کہ ہمارے رب ہم ایمان لائے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے' تو تم نے انہیں ٹھٹھا بنالیا۔ یہاں تک کہ انہیں بنانے کے شغل میں تم میری یاد بھول گئے اور تم ان سے ہنسا کرتے تھے۔"

ناظرین کرام! جو لوگ ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنے والوں کا تمسخر اڑاتے ہیں اور مسلمانوں کو دُعا مانگتا دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف طنزاً اشارے کرتے ہیں' تو وہ اس آیت پر غور کریں کہ ہاتھ اُٹھا کر دُعائے مغفرت کرنے والوں کا تمسخر اڑا کر کیا وہ مذکورہ بالا آیت کا مصداق تو نہیں بن رہے؟

دُعا نہ مانگنے والوں کے متعلق سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کا فرمانِ مبارک (مشکوٰۃ شریف جلد اول ص ۱۹۵)

عن ابوھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہٖ وسلم من لم یسئل اللہ یغضب علیہ۔

(ترجمہ) "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا جو خدا تعالیٰ سے دُعا نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ کو اس پر غضب آتا ہے۔"

قارئین کرام! مقامِ غور ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے دُعا نہ مانگے تو اللہ تعالیٰ کو اس پر غضب آتا ہے۔ تو جو شخص نہ خود دُعا مانگے اور نہ ہی دوسروں کو مانگنے دے، تو اس پر خدا تعالیٰ کے غضب کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں ہوگا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اجیب دعوۃ الداع اذا دعان ۝ (قرآن کریم)

(ترجمہ) "دُعا قبول کرتا ہوں، دُعا مانگنے والوں کی، جس وقت مجھ سے مانگے۔"

فائدہ: اس آیتِ کریمہ سے ان لوگوں کا جھوٹ واضح ہوگیا۔ جو یہ کہتے ہیں کہ نمازِ جنازہ کے بعد دُعا مانگنا ناجائز ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ عالیہ کے سراسر خلاف ہے۔ اذا دعان عموم پر دال ہے۔ تو جو شخص کہتا ہے کہ جنازہ کے بعد دُعا نہ مانگو، تو اس کو تخصیص ثابت کرنا ہوگی۔

دوسری جگہ فرمایا: وقال ربکم ادعونی استجب لکم۔

(ترجمہ) "اور تمہارے رب تعالیٰ نے فرمایا مجھ سے دُعا کرو میں قبول کروں گا۔"

قارئین کرام! اب ایک طرف حکمِ خداوندی ہے کہ جس وقت مرضی ہو مجھ سے دُعا کرو۔ چاہے اپنے لیے کرو، چاہے اپنے اہل وعیال کے لیے کرو، چاہے مُردوں

کے لیے کرو، میں ہر وقت قبول کرتا ہوں، تو دوسری طرف سے چند انتشار پسند عناصر کہتے ہیں کہ خبردار! مُردوں کے لیے خدا تعالیٰ سے دُعا نہ مانگو۔ اب آپ کی مرضی، چاہیں تو آپ خالقِ کائنات جل شانہٗ کی مانیں اور چاہیں تو ایک انتشار پسند گروہ کی مانیں۔ اب اگر کوئی دلائلِ قاہرہ سے مجبور ہو کر یہ کہے کہ مُردہ کے لیے دُعا کے ہم بھی قائل ہیں، لیکن زبانی مانگو اور ہاتھ اُٹھا کر نہ مانگو تو یہ
ان لوگوں کی محرومی کی دلیل ہے۔ مسلمان کہلانے والا جب خدا تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھانے سے ہچکچاتے ہوئے عار محسوس کرے، اور دوسروں کو بھی منع کرے کہ خبردار! اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ نہ اُٹھائیں، تو اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بدبختی ہو سکتی ہے؟

ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے والے خوش نصیب لوگوں کے متعلق فرمانِ مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم

(مشکوٰۃ شریف ص ۱۹۵۔ ابن ماجہ شریف)

قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ان ربکم حیی کریم یستحیی من عبدہٖ اذا رفع یدیہ ان یردھما صفراء۔

(ترجمہ) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تحقیق تمہارا رب تعالیٰ بہت ہی حیا والا اور سخی ہے اور اسے حیا آتا ہے کہ اس کا بندہ ہاتھ اُٹھائے اور وہ اسے خالی لوٹا دے۔"

ناظرین کرام! جب یہ ثابت ہو گیا کہ ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے والوں کی

دُعا کو رد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو شرم آتی ہے اور ان کی دُعا کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے تو جو لوگ میت کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے سے منع کرتے ہیں۔ شاید ان کو اپنے مُردے کے بخشوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ان کو اپنے مُردے کے ساتھ دشمنی ہے کہ اگر ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگیں، تو کہیں انہیں خدا تعالیٰ معاف ہی نہ کر دے۔ اب دُعا میں ہاتھ اُٹھانے کے متعلق ترغیب تو مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہو رہی ہے اور ساتھ ہی اجابتِ دُعا کی خوشخبری بھی دی جا رہی ہے۔ تو اب منکرین کو ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے میں نقصان کونسا ہے؟ بغیر اس کے کہ ان کی حالت سے تکبر اور ذاتِ باری تعالیٰ سے بے پروائی ظاہر ہوتی ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کے طریقے کی مخالفت کی وجہ سے ناراضگیٔ خدا کا نشانہ بنتے ہیں۔

دُعا میں ہاتھ اُٹھانے کے متعلق سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک اور فرمان

(مشکوٰۃ شریف صـــ ۱۹۵)

قال قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم اذا سألتموا اللہ فاسئلوہ ببطون اکفکم ولا تسألوہ بظهورها فاذا فرغتم فامسحوا وجوهكم۔ (رواہ ابوداؤد)

(ترجمہ) حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان ہے،

جس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگو تو ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے مانگو اور ہاتھوں کی پشت کے ساتھ نہ مانگو اور جب دُعا سے فارغ ہو جاؤ تو دونوں

ہاتھوں کو اپنے مونہوں پر پھیرو۔"

قارئین کرام! حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان عام ہے، یعنی جس وقت بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگو، چاہے کسی زندہ کے لیے مانگو، چاہے کسی مُردہ کے لیے مانگو، تو ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے مانگو۔ یہاں یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ جب اپنے لیے دُعا مانگو یا اپنے کسی زندہ کے لیے مانگو تو ہاتھ اٹھا کر مانگو۔ لیکن جب کسی مُردے کے لیے دُعا مانگنے لگو، تو ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ یہ عام اپنے عموم پر ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان مُردہ کے لیے دُعائے مغفرت کے ماسوا کے لیے ہے، تو پھر عام مخصوص البعض ہو گا اور اسے دکھانا ہو گا کہ مخصص کون ہے؟ اور مخصص کے لیے کیا کیا شرائط ہیں؟ اور کیا اس میں یہ شرائط پائی گئی ہیں؟ اب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کو پڑھ لینے کے بعد کوئی احمق ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنا بدعت ہے۔

مقامِ غور! مُردے کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا ایسا فعل ہے کہ جس پر امتِ مسلمہ کے تمام گروہوں کا اتفاق ہے۔ حتیٰ کہ علمائے دیوبند بھی مردہ کے لیے آج تک ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگتے چلے آتے ہیں۔ تو اب اگر کوئی شخص میت کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنے کو بدعت کہے تو سنتِ رسول کو بدعت کہنے کے ماسوائے اس کو اپنے آباؤ اجداد، استاد، پیر و مرشد اور ان کے تمام پیروکاروں کو بدعتی کہنا پڑے گا اور ایسا کہنے والا شخص وہی ہے جو کہتا ہے "ہر بدعت گمراہی ہے۔" تو پھر اس کو اپنے پیروں، استادوں اور اپنے باپ، دادا کو اپنے خیال کے مطابق ایسی گمراہی کے ارتکاب کی وجہ سے گمراہ اور ضال کہنا پڑے گا، لہٰذا ایسے کہنے والے شخص کو اپنے آباؤ اجداد، استاد، پیر و مرشد اور تمام مسلمانوں پر رحم کرتے ہوئے

اپنے قول اور فعل سے توبہ کرنی چاہیے۔ بعض نام نہاد مولوی صاحبان اپنی جان چھڑانے کے لیے اپنے جاہل متقدیوں کی آنکھوں میں دُھول جھونکتے ہوئے کہتے ہیں کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں اور حدیثیں ضعیف بھی ہوتی ہیں، تو ایسے شخص کے مُنہ پر مُہر لگانے کے لیے ہم نے میت کے لیے سرکارِ دو عالم نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا جس حدیثِ پاک سے ثابت کیا ہے، اس کی تائید و توثیق میں علمائے دیوبند کے پیشوا، کا حوالہ درج کرتے ہیں:

فاتحہ خوانی کے متعلق علمائے دیوبند کے پیشوا کا فتویٰ (المنہاج الواضح یعنی راہِ سنّت ص۲۵۷)

(مصنفہ مولوی محمد سرفراز خان شیخ الحدیث نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

"میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے۔ چنانچہ آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) نے رفع یدیہ ثم قال اللّٰھم اغفر لعبید ابی عامر (مسلم شریف جلد دوم ص۳۰۳) فرمایا۔

(ترجمہ) حضرت عبید ابی عامر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے لیے ان کی وفات کی خبر سُن کر (آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے) ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگی تھی۔

چیلنج

اگر کوئی شخص ایک حدیث بھی ایسی دکھا دے کہ جس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہو کہ میت کے لیے دُعا تو مانگو لیکن خبردار! ہاتھ نہ اُٹھانا۔ تو اسے پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) روپے نقد انعام دیا جائے گا۔

نوٹ: اگر کوئی شخص ہماری کسی تصنیف "تبلیغ دین" کے لیے شائع کرنا چاہے، تو اسے اجازت ہے۔

دُعائے مغفرت کن لوگوں کے لیے منع ہے

اس پُرفتن دَور میں بعض نام نہاد توحید پرست شر پسند لوگ دُعا مانگنے سے سختی سے منع کر رہے ہیں اور اپنی تقریروں میں یہ کہہ رہے ہیں کہ جو شخص فوت شدہ شخص کے لیے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگے گا، تو ہم اُس کا جنازہ نہیں پڑھیں گے، یعنی ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ سے میت کے لیے دُعا مانگنا ایک گناہِ کبیرہ ہے، کیونکہ فتویٰ ہمیشہ اس شخص کے خلاف لگایا جاتا ہے، جو کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں تو ایسے لوگوں کا ایمان ہی متزلزل نظر آتا ہے۔ خدائے کریم سے دُعا مانگنے والوں کو نہ صرف دُعا سے روکنا، بلکہ ان پر فتویٰ لگانا یہ کسی نام نہاد مولوی اور عقل و خرد سے عاری شخص ہی کا کام ہو سکتا ہے اور ساتھ ہی جب مسلمانوں کو میت کے لیے دعائے مغفرت کرنے سے منع کیا جا رہا ہے، تو یہاں پر انسانی ذہن ایک خاص بات کی طرف چلا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا تو ہر وقت جائز ہے اور اللہ تعالیٰ بھی دُعا مانگنے والوں پر ہر وقت رحمت و شفقت فرماتا ہے، لیکن صرف ایک ہی صورت ایسی رہ گئی ہے کہ شاید وہ مردہ ایسا ہے کہ جس کے لیے دُعا مانگنا شرعی طور پر ناجائز ہے۔ اللہ رب العزت نے مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کرنے سے روکا ہے:

(۱) ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا للمشرکین ○ (قرآن مجید)

(ترجمہ) "نہیں لائق واسطے نبی کے اور واسطے ان لوگوں کے کہ ایمان لائے ہیں کہ بخشش مانگیں واسطے مشرکوں کے۔"

یاد رہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے منافقین کے لیے بھی دعائے مغفرت کرنے سے روکا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

(۲) ولا تصل علیٰ احد منھم مات ابدًا
ولا تقم علیٰ قبرہٖ ۰ (قرآن مجید)

(ترجمہ): اور مت نماز پڑھ اوپر کسی کے ان میں سے کہ مر جائے کبھی
اور مت کھڑا ہو اوپر قبر اس کی کے۔"

قارئین کرام! مقامِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو صرف مشرکوں اور منافقوں کے لیے دُعائے مغفرت کرنے سے روکا ہے۔ اب جو لوگ اپنی میت کے لیے دُعائے مغفرت نہیں کرتے، تو پھر وہ اپنی میت کو کیا سمجھتے ہیں؟ یا پھر وہ اپنے مُردوں کے لیے دُعائے مغفرت اس لیے نہیں کرتے کہ انہیں یقین ہے کہ ہم چاہے خدا تعالیٰ سے جتنی مرتبہ ہی کیوں نہ مانگیں، اس نے تو بخشنا ہی نہیں کیونکہ ہمارا مُردہ اس قابل ہی نہیں کہ اسے بخشا جائے۔ اس لیے وہ اپنے مُردوں کے لیے دُعائے مغفرت نہیں مانگتے۔ تو یہ گروہ قرآن کریم کی رُو سے مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہے، کیونکہ قرآن حکیم نے فرمایا ہے:

والذین جاءو من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا
ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ۰

(ترجمہ): اور واسطے ان لوگوں کے کہ آئے پیچھے ان کے کہتے ہیں اے پروردگار ہمارے! بخش دے ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو، وہ جو آگے لائے ہم سے ایمان۔"

اب قرآن کریم کی رُو سے تو مسلمانوں کے دو گروہ ہوئے۔ ایک گروہ تو ان لوگوں پر مشتمل ہے جو وفات پا گئے ہیں۔ اور دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے فوت شدہ مسلمان بھائیوں کے لیے خدا تعالیٰ سے دُعائے مغفرت کرتے ہیں۔ اب جو لوگ اپنے مردہ بھائیوں کے لیے دُعائے مغفرت نہیں کرتے، وہ نہ تو

پہلے گروہ میں شامل ہے، کیونکہ اس گروہ کے افراد تو وفات پا گئے اور نہ دوسرے
گروہ میں شامل ہے۔ کیونکہ وہ تو دعائے مغفرت کرنے والوں کا گروہ ہے،

ہماری اتنی تمہید کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید نے مشرکوں اور منافقوں کے لیے دُعائے مغفرت کرنے سے منع کیا ہے اور مسلمانوں کے لیے دُعائے مغفرت کرنے کا حکم دیا ہے۔ اب فیصلہ قارئین پر ہے کہ اگر اپنے فوت شدہ بھائیوں کو دعائے مغفرت کا اہل سمجھتے ہیں تو ضرور دعا مانگیں اور اگر انہیں دُعائے مغفرت کے قابل نہیں سمجھتے تو نہ مانگیں۔

مقامِ افسوس ہے کہ بعض لوگ مجلسِ فاتحہ خوانی میں خلاف شرع چیزیں مثلاً دُنیاوی باتیں، ہنسی مزاح، گلہ شکوہ اور حقہ و سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مجلسِ فاتحہ خوانی کو ان امور سے پاک کیا جاتا، لیکن بعض کم فہم اور نام نہاد مولوی اُلٹا فاتحہ خوانی سے ہی روک رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان نام نہاد مولویوں کو ہدایت دے کہ مسلمانوں کو قرآن خوانی سے منع کرتے ہیں اور غلط و ناجائز امور سے روکتے ہوئے ان کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

مُردوں کے لیے زندوں کی دعائے مغفرت کرنے کا فائدہ (مشکوٰۃ شریف ص۲۰۶)

حضرت عبداللہ ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

ما المیت فی القبر الا کالغریق المتغوث ینتظر دعوۃ تلحقہ من اب او ام او اخ او صدیق فاذا الحقتہ کان احب الیہ من الدنیا وما فیھا و ان اللہ تعالیٰ لیدخل الی اھل القبور من دعاء اھل الارض امثال الجبال وان ھدیۃ الاحیاء الی الاموات الاستغفار لھم۔

(ترجمہ) "مُردہ کی حالت قبر میں ڈوبتے ہوتے فریاد کرنے والے کی طرح ہوتی ہے۔ وہ انتظار کرتا ہے کہ اس کے باپ یا ماں یا بھائی یا دوست کی طرف سے اس کو دُعا پہنچے اور جب اس کو کسی کی دُعا پہنچتی ہے تو دُعا کا پہنچنا اس کو دُنیا و ما فیہا سے محبوب تر ہوتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ اہلِ زمین کی دُعا سے اہلِ قبور کو پہاڑوں کی مثل اجر و رحمت عطا کرتا ہے اور بے شک زندوں کا تحفہ مُردوں کی طرف یہی ہے کہ ان کے لیے بخشش کی دُعا کی جاتے۔"

اس حدیث شریف سے مُردے کا زندوں کی طرف سے کی جانے والی دُعا اور بخشش کا منتظر ہونا اور زندوں کے ہدیے و تحفے یعنی دُعائے بخشش کا اس کے لیے بہت ہی زیادہ مفید ہونا بخوبی ثابت ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہُ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

یتبع الرجل یوم القیامۃ من الحسنات امثال الجبال فیقول انّٰی ھذا؟ فیقال باستغفار ولدک لک۔ (شرح الصدور ص)

(ترجمہ) "قیامت کے دن پہاڑوں جیسی نیکیاں انسان کے (اعمال سے) لاحق ہوں گی تو وہ کہے گا کہ یہ کہاں سے آئی ہیں؟ تو فرمایا جائے گا یہ تمہاری اولاد کے استغفار کے سبب سے ہیں، جو تمہارے لیے کیا گیا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جنت میں اپنے ایک نیک بندے کا درجہ بلند فرمایا۔"

(۱) فیقول یارب انی لی (مشکوٰۃ شریف)

(۲) فیقول باستغفار ولدك لك (مشکوٰۃ شریف)

(۱) (ترجمہ) "تو وہ عرض کرتا ہے کہ اے میرے رب میرا درجہ کیونکر بلند ہوا؟

(۲) (") "ارشاد ہوا کہ تیرا بیٹا جو تیرے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے، اس کے سبب سے۔"

مندرجہ بالا حدیث پاک سے ثابت ہوا کہ اگر کسی نیک بندے یا کسی بزرگ کے لیے دعائے بخشش کی جائے تو اس کے درجے بلند ہو جاتے ہیں۔ اور اگر گنہ گار کے لیے کی جائے، تو اس سے سختی اور عذاب دور ہو جاتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

"شرح الصدور" (مصنفہ حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اُمتی امۃ مرحومۃ تدخل قبورھا بذنوبھا وتخرج من قبورھا لاذنوب علیھا تمحص عنھا باستغفار المؤمنین

(ترجمہ) "میری امت، امتِ مرحومہ ہے، وہ قبروں میں گناہوں کے ساتھ داخل ہوگی اور جب قبروں سے نکلے گی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کے استغفار کی وجہ سے اس کو گناہوں سے پاک و صاف کر دے گا"

ایصالِ ثواب کے منکر معتزلہ ہیں

مذہبِ حنفی کے عقائد کی مسلمہ کتاب "شرح عقائد نسفی" میں ہے:

وفی دعاء الاحیاء للاموات اوصدقتهم عنهم نفعٌ لهم خلافاً للمعتزلة۔

(ترجمہ) "اور زندوں کا مُردوں کے لیے دُعا کرنا یا صدقہ و خیرات کرنا مُردوں کے لیے نفع کا باعث ہے اور معتزلہ اس کے خلاف ہیں"

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے، تو فرمایا: "ان دونوں قبر والوں کو عذاب ہو رہا ہے اور وہ کسی بڑے گناہ کی وجہ سے نہیں، بلکہ ایک تو پیشاب کرنے کے وقت چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا چُغل خور تھا۔"

ثم اخذ جريدة رطبة فشقها بنصفين ثم غرز فی کل قبر واحدة قالوا یارسول اللہ لم صنعت هذا؟ فقال لعله ان یخفف عنهما مالم ییبسا۔ (بخاری شریف جلد اول ص۱۸۲) (مسلم شریف جلد اول ص۱۴۱۔ مشکوٰۃ شریف)

(ترجمہ) "پھر آپ نے کھجور کی ایک تر شاخ لی اور درمیان سے چیر کر اس کے دو حصے کر کے دونوں قبروں پر گاڑ دیے صحابہ کرام

نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم)، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ جب تک یہ شاخیں ہری رہیں گی، ان کے عذاب میں تخفیف رہے گی۔"

اس حدیث پاک سے درج ذیل امور ثابت ہوتے

- حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے عالم برزخ کا حال بھی پوشیدہ نہیں۔
- ان قبروں والے اپنی زندگی میں جس گناہ کا ارتکاب کر کے گرفتارِ عذاب ہوتے تھے، آپ کو اس کا علم تھا۔
- اور اس حدیث پاک نے ان لوگوں کے نظریے کو بھی باطل قرار دے دیا۔ جو یہ کہتے ہیں کہ رُوح کی قبر اور ہے، جو کہ زمین پر نہیں، بلکہ اعلیٰ علیین یا سجین میں ہوتی ہے اور عذاب رُوح کو ہوتا ہے جسم کو نہیں ہوتا۔
- حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے قبر پر تر شاخیں رکھ کر اسے باعثِ تخفیفِ عذاب قرار دیا۔

تو اَب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عذاب میں تخفیف شاخوں کی وجہ سے ہوتی یا کسی اور وجہ سے۔ اگر صرف شاخوں کو عذاب میں تخفیف کا سبب قرار دیا جائے، تو پھر سوکھنے کے بعد بھی شاخوں کا قبر پر ہونا باعثِ تخفیف عذاب ہونا چاہیے تھا، حالانکہ ایسا نہیں۔ معلوم ہوا کہ تخفیفِ عذاب کا باعث صرف وہ تر شاخیں ہی نہیں، بلکہ ان کی وہ تسبیح ہے جو وہ پڑھتی ہیں، کیونکہ

وان من شیئٍ الا یسبح بحمدہٖ (قرآن مجید)

(ترجمہ): "ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔"

اور چونکہ شاخوں کا سوکھ جانا ان کی موت ہے، اور موت سے تسبیح ختم ہو گئی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ تخفیفِ عذاب کا باعث شاخوں کی تسبیح تھی۔ جب شاخوں کی تسبیح باعثِ تخفیفِ عذاب قبر ہے، تو پھر بندوں کی تسبیح بھی یقیناً باعث تخفیف عذاب ہو گی۔

شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اسی حدیث پاک کے تحت
نقل فرماتے ہیں ، "جب نباتات کی تسبیح سے تخفیفِ عذاب ہو سکتی ہے تو جب حافظ
اپنی پاک زبان سے قبر پر قرآن مجید کی تلاوت کرے ، تو عذاب میں تخفیف بطریق اولیٰ ہوگی"
نیز یہاں سے یہ بھی ثابت ہوا کہ قبروں پر پھول ڈالنا بھی جائز ہے کیونکہ کھجور
کی تر شاخوں کی طرح تر و تازہ پھول بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

اسی لیے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فتاویٰ عزیزیہ
جلد اول میں فرماتے ہیں :

"قبر پر پھول اور خوشبو والی کوئی چیز رکھنا صاحب قبر کی روح
کی مسرت کا باعث ہے اور یہ شرعاً جائز ہے۔"

حضرت امام شعبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں :

کانت الانصار اذا مات لھم المیت اختلفوا
الیٰ قبرہٖ یقرءون لہ القرآن (شرح الصدور)

(ترجمہ) "انصار کا یہ طریقہ تھا کہ جب ان کا کوئی آدمی مر جاتا، تو وہ
بار بار اس کی قبر پر جاتے اور اس کے لیے قرآن کریم تلاوت کرتے۔"

میت کے لیے صدقہ و خیرات کرنا

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک شخص نے
حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ یارسول اللہ!
میری ماں مر گئی ہے اور اس نے بوقتِ وفات کچھ وصیت نہیں کی۔

فھل لھا اجرٌ ان تصدقت قال نعم۔

(مسلم کتاب الصلوٰۃ ۔ بخاری شریف باب الوصایا ۔ ابو داؤد شریف)

(ترجمہ) اگر میں صدقہ کروں تو کیا اس کو ثواب پہنچے گا ؟ آپ نے فرمایا "ہاں"۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انہوں

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا،

یارسول اللہ ھل ینفعھا ان اتصدق عنھا فقال
رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم
نعم فقال حائطٌ کذا وکذا صدقۃٌ عنھا۔
(بخاری شریف جلد اول ص۳۸۶ نسائی شریف کتاب الوصایا)

(ترجمہ) "یارسول اللہ! اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کو نفع پہنچے گا۔ آپ نے فرمایا: ہاں! پہنچے گا۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: پھر میرا فلاں باغ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں عرض کی: یارسول اللہ میری ماں مر گئی ہے۔

ان ینفعھا ان تصدقت عنھا قال نعم قال فان
لی مخرافاً واشھدك انی قد تصدقت عنھا۔
(ترمذی شریف کتاب الصلوٰۃ)

(ترجمہ) "اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کو نفع پہنچے گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں پہنچے گا۔ اس نے کہا: میرا ایک باغ ہے اور میں آپ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اس باغ کو اس کی طرف سے صدقہ کر دیا۔"

ان احادیثِ مبارکہ سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ مرنے والے کے عزیزوں نے اگر کوئی صدقہ و خیرات اس نیت سے کرے کہ اس سے مردہ کو نفع پہنچے تو اس کو یقیناً فائدہ پہنچتا ہے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! میری ماں مرگئی ہے۔

فانی صدقۃ افضل قال الماء فحفر بئراً وقال

ھٰذہٖ لام سعد (ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص۲۴۳)

(ترجمہ) تو کونسا صدقہ افضل ہے؟ (جو ماں کے لیے کروں) فرمایا پانی!

تو حضرت سعد (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے کنواں کھدوایا اور کہا: یہ سعد کی

ماں کے لیے ہے۔

اس حدیث پاک میں یہ بات نہایت ہی قابل غور ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی فرمارہے ہیں، ھٰذہٖ لام سعد (یہ کنواں سعد کی ماں کے لیے ہے) یعنی ان کی رُوح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔ اس سے صراحۃً ثابت ہوا کہ جس کی رُوح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے کوئی صدقہ و خیرات کی جائے۔ اگر اس صدقہ و خیرات اور نیاز پر مجازی طور پر اس کا نام لیا جائے۔ یعنی یوں کہا جائے کہ یہ سبیل حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے لیے ہے۔ یا یہ کھانا یا یہ نیاز صحابہ کبار، سیدنا غوثِ اعظم یا خواجہ غریب نواز (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے لیے ہے، تو ہرگز ہرگز اس سبیل کا پانی اور وہ کھانا وغیرہ حرام نہ ہوگا۔ ورنہ پھر یہ کہنا پڑے گا کہ اس کنوئیں کا نام حرام تھا۔ حالانکہ اس کنوئیں کا پانی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین نے پیا۔

کیا کوئی مسلمان کہہ سکتا ہے کہ ان سب مقدس حضرات نے حرام پانی پیا تھا (معاذ اللہ) کوئی مُسلمان تو ایسا ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ تو جس کنوئیں کے لیے یہ کہا جائے کہ یہ سعد کی ماں کے لیے ہے، اس کنوئیں کا پانی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک حلال و طیب ہے۔ تو جس سبیل کے پانی کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ حضرت امام حسین اور شہدائے کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے لیے ہے یا "یہ نیاز فلاں بزرگ کے لیے ہے" تو وہ مسلمانوں کے لیے بھی حلال و طیب ہے۔